نومبر ۱۹۶۳ء

مُدیرِ اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

نگار پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

خدا نمبر

خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے اہم سوالات ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر باشعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن افسوس کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے۔ نگار کا ''خدا نمبر'' اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے۔

★

قیمت: تین روپے

SHARBAT ROOH AFZA
اپنے عزیز مہمانوں اور دوستوں
کو روح افزا پیش کرنا موسمِ گرما
کے آداب میں شامل ہے۔
روح افزا
اب باآسانی دستیاب ہے
HFP
مشروبِ
مشرق
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس - لاہور - کراچی

جراثیم سے پاک گھر
بیماریوں سے
محفوظ رہتا ہے

ہر قسم کے جراثیم کو ہلاک کرنے کیلئے

جرمیڈال

استعمال کیجیے
بہترین اینٹی سپٹک اور جراثیم کش

قریب ترین کیمسٹ سے طلب کیجیے

EPLA

مینوفیکچررز:- ایسٹرن فارماسیوٹیکل لیبوریٹریز لمیٹڈ
کراچی - پاکستان

EPLA-5/63 Crescent

صحت اور دانت

صحت کا دارومدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن' جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے' دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو اسی کا انتخاب کرنا چاہیئے۔

صفائی اور مالش:۔ ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے نکوٹین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ:۔ ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار:۔ ہمدرد منجن کی دیرپا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔

ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ

NATIONAL 994/B

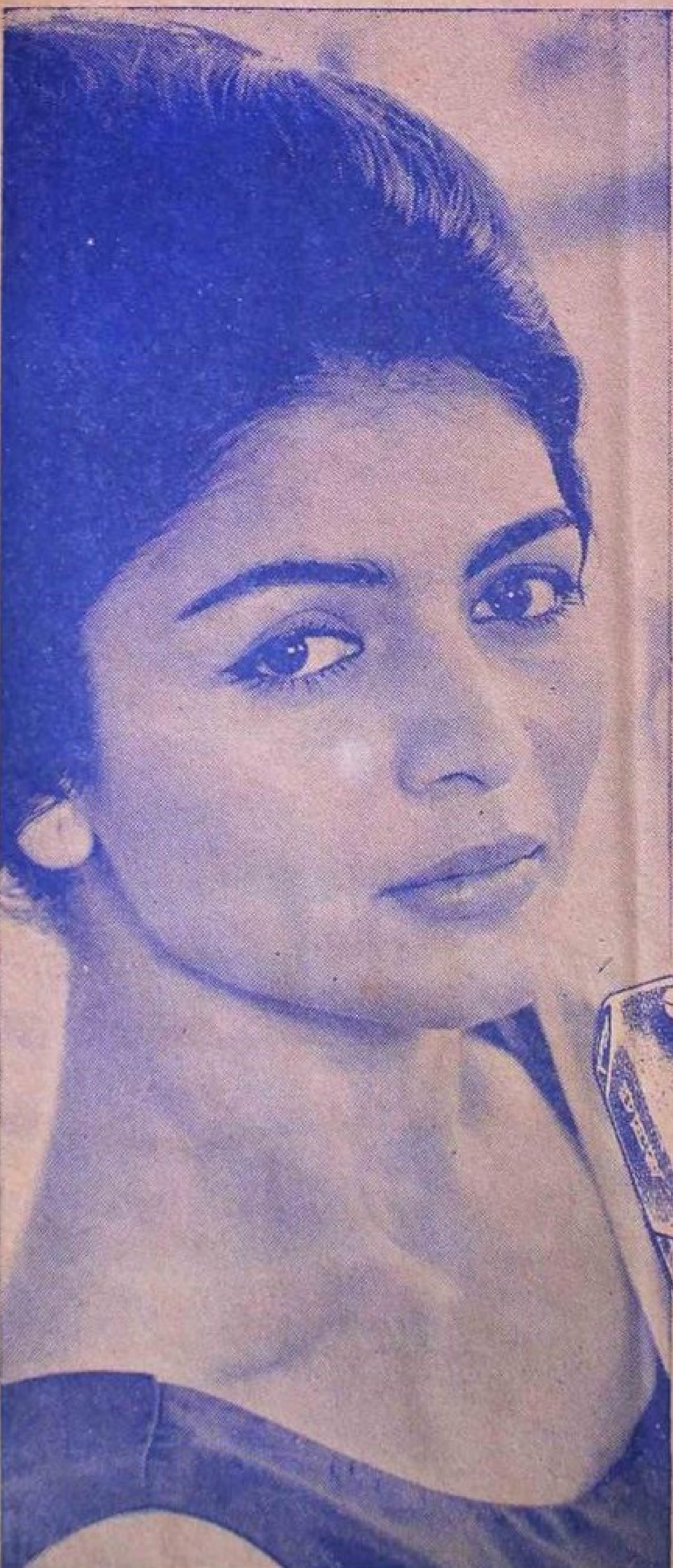

ڈیو

ٹائلٹ صابن

لطیف اور معطّر

ڈیو ٹائلٹ صابن کی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو نے بیشتر خواتین و حضرات کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اسکے لطیف اور چکنے جھاگ آپکی جلد کو ریشم کی طرح ملائم اور صاف ستھرا رکھنے کے علاوہ دیرپا تازگی اور فرحت بخشتے ہیں۔ آپ بھی ڈیو ٹائلٹ صابن آزمائیے۔

قیمت ۶۰ پیسے

ڈیو صابن کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے
اسے چمکدار پنی میں بھر بند کیا گیا ہے!

فیروز سنز
لیبارٹریز لمیٹڈ
نوشہرہ، مغربی پاکستان

طبیعت میں گرانی محسوس ہو

تو صبح اٹھتے ہی فرحت بخش گریپ سالٹ کی ایک خوراک
لے لیجئے اور دن بھر چاق وچوبند رہیئے۔

گریپ سالٹ

کی ایک بوتل ہمیشہ ساتھ رکھئے

گریپ سالٹ

- سوءِ ہضم　• تیزابیت
- قبض　• سر چکرانا
- سینے کی جلن　• نفخ

کا مجرب ترین علاج ہے۔

ہر کیمسٹ سے دستیاب ہے

ایسٹرن فارماسیوٹیکل لیبوریٹریز لمیٹڈ - کراچی (پاکستان)

EPLA-1/63

Crescent

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲ ٹیلی فون نمبر ۷۴۶۹۳

نومبر سنہ ۱۹۶۳ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری ــــــ عارف نیازی

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
۷۵ پیسے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/الیف - یو - پی - بی ۳۶۶۹ - ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر پبلشر ایم عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا

داھنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا

فہرست

شمارہ ۱۱	فہرست مضامین نومبر ۱۹۶۳ء	۴۲ واں سال

ملاحظات .... یاد رفتگاں .... نیاز فتح پوری ۳
میرا نظریہ شعر اور میری شاعری .... جمیل مظہری ۹
پنگھٹ پر .... نیاز فتح پوری ۱۶
ادب اور اخلاق .... ڈاکٹر سید محمد یوسف ۱۷
استفادہ یا سرقہ .... فرمان فتح پوری ۲۰
مومن کی معشوق فریبیاں .... عندلیب میرٹھی ۲۳
ریاض گورکھپوری .... خیر بہوروی ۲۸
مولانا آزاد اپنے خطوط کے آئینہ میں .... نیاز فتحپوری ۳۸
منیر شکوہ آبادی .... ضیاء احمد بدایونی ۴۱
درگا دتی .... سرفراز نیازی ۴۹
میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں .... نیاز فتحپوری ۵۱
باب الاستفسار
۱- کس کے اشعار ہیں
۲- شیریں فرہاد و خسرد
۳- ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے
۴- غالب تخلص رکھنے والے شاعر
.... نیاز فتحپوری ۵۳
منظومات .... دل شاہجہانپوری - منظور حسین شور
شورش کاشمیری - فضا ابن فیضی - ساقی جاوید
طالب جے پوری - شارق ایم اے - عاصم جے پوری
منظر ایوبی - سعادت نظیر - ۵۸
مطبوعات موصولہ .... ادارہ ۶۷

ملاحظات

یادِ رفتگاں

(نیاز فتحپوری)

عنفوانِ شباب میں، میری زندگی جس ماحول میں گزری، وہ بڑا پُرسکون و پُر رونق ماحول تھا، گھر کے اندر بھی اور گھر سے باہر بھی۔ شام کو جس وقت زمین پر چاندنی بچھا کر دسترخوان چُنا جاتا تھا اور بچے، جوان، بوڑھے اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، گھر میں کوئی بارات اُتری ہے۔ اور قریب قریب یہی منظر اس وقت بھی سامنے ہوتا تھا جب مردوں کے بعد عورتوں کی باری آتی تھی۔ گھر سے باہر متعدد احباب سچی محبت کرنے والے اور وقت پڑے تو جان پر کھیل جانے والے۔ سادہ زندگی، سادہ معاشرت، کھلی فضا، صاف ہوا، الغرض کچھ ایسی تھی بے خلل زندگی جو کامل اٹھارہ سال تک گزاری۔ لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ زندگی میں جو پے در پے انقلاب آنا شروع ہوئے تو چند سال میں یہ سارا طلسم نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اور ایک ایک کرکے یہ سارے چراغ گُل ہوگئے۔ بھرا پُرا گھر اجڑ گیا۔ احباب ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور پھر وہ وقت آیا کہ میں سب سے بڑا تھا۔ یہ بات آج کی نہیں، اب سے ۴۰ سال پہلے کی ہے۔ اس وقت کا کیا ذکر کہ جب خود میں بھی میں نہیں رہا۔ دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ اور وطن سے وطنیت کا تعلق صرف اتنا رہ گیا ہے کہ وہاں اپنے اعزہ و احباب آسودۂ خاک ہیں اور انکے خیال سے اب بھی آنکھیں اشک آلود ہوجاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معنی میں وطن بار بار نہیں بنتا اور نہیں بنا، لیکن سفرِ زندگی میں مختلف "کارواں سرایوں" سے گزرنا پڑا جن میں آخری کارواں سرائے لکھنؤ تھی لیکن آخر کار اسے بھی چھوڑ کر کراچی میں ڈیرہ ڈالا۔ دیکھئے اب کس وقت یہاں سے رختِ سفر باندھنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ اطمینان ضرور ہے کہ یہ سفر عارضی نہ ہوگا۔ کوچ ہوگا اس آخری منزل کی طرف جس کے بعد پھر منزل و نشانِ منزل سب محو ہوجاتے ہیں۔

یہ ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ میں زندگی سے بیزار ہوگیا ہوں یا یہ کہ اب میں تھک کر معطل زندگی کا سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا احساسِ سکون صرف عدمِ سکون ہی کے احساس سے وابستہ ہے اور ایک سپاہی کی طرح گھوڑے کی پیٹھ ہی پر جان دینا پسند کرتا ہوں۔ البتہ اس دوران میں بعض ایسی ہستیاں ضرور اُٹھ گئیں جن کی جُدائی کا مجھے بڑا قلق ہے۔ اس مہینے کے ملاحظات انھیں کی یاد کے لئے وقف ہیں۔

علامہ مشرقی

قریب قریب میرے ہی ہم عمر تھے۔ اور ان سے میری ارادت کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کی تصنیف تذکرہ میری نگاہ سے گزری۔ جسوقت انہوں نے اپنی یہ تصنیف مجھے بھیجی تو اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ کتاب دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرکے انھیں بھیجدوں۔ چنانچہ میں نے ان کے اس ارشاد کی تعمیل میں صرف یہ مصرع لکھ کر ان کو بھیجدیا۔

صبح می ریزد گل خورشید در دامان ما

یہ زمانہ وہ تھا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور مشکل ہی سے کوئی دوسرا مذہبی لٹریچر اس کی جگہ لے سکتا تھا، لیکن تذکرہ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ "گوشۂ زنداں" میں ایک یوسف اور بھی ہے۔ وہی خطیبانہ انداز، وہی الفاظ کا

تجمل، وہی لب ولہجہ کی شوکت اور وہی حکیمانہ بصیرت الغرض ادب و مذہب کا اتنا دلکش و ساحرانہ امتزاج اب تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ بہرحال میں نے سب سے پہلے مشرقی کو ان کے تذکرہ میں پڑھا، اس کے بعد ان کی "خاکسار تحریک" کے سلسلہ میں ان کا مطالعہ کیا اور قطع نظر اس سے کہ ان کا نصب العین کیا تھا، خدمت اسلام کے لئے ان کے اقدام کی نوعیت کیا تھی، ان کی اجتماعی تنظیم میں فکر و عمل کا توازن کیا تھا، الغرض ان تمام انتقادانہ پہلوؤں سے ہٹ کر، مجھے اس کا یقین ضرور تھا کہ وہ اپنی ذات سے بڑے مخلص انسان تھے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ ہر مخلصانہ قدم "کار آگہانہ" بھی ہو۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد ان کی جماعت و تحریک پر کیا گزری اور نہ مجھے اس کے جاننے کی ضرورت، کیونکہ اب بھی میرے ذہن پر ان کی وہی شخصیت چھائی ہوئی ہے جو "تذکرہ" دیکھ کر میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوئی تھی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی وہ بدستور اسی طرح قائم ہے۔

مردان خدا خدا نہ باشند
لیکن ز خدا جدا نہ باشند

سید صدیق حسن

کون تھے، کیا تھے اور وہ سرزمین بھارت اور دنیائے انسانیت کا کتنا بڑا حصہ ویران کر گئے، اس کا علم اہل پاکستان کو نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں میں وہ حکومت بھارت کے سب سے سینئر آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ یو۔ پی کے ریونیو بورڈ کے ایگزیکٹو صدر، صوبہ بھر کے تمام ریونیو افسران کی قسمت کے مالک، اور گورنر کے بعد سب سے بڑے سرکاری افسر۔ لیکن مرحوم کی ان خصوصیات کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ دنیاوی حیثیت سے وہ کسی ایسے مرتبہ پر فائز تھے، جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا، بلکہ صرف اس لئے کہ ان عظیم مراتب دنیاوی کے ساتھ، وہ اخلاق کی جس بلندی و پاکیزگی کے حامل تھے، وہ میں نے نہ کسی خانقاہ میں پائی نہ کسی درسگاہ مذہب میں، ایوان حکومت کا کیا ذکر۔

وہ کڑا (الہ آباد) کے ایک قدیم سید گھرانے کے فرزند تھے، جو نسبی عزت و شرافت تو ضرور رکھتا تھا، لیکن جاہ و ثروت یا دولت و امارت سے یکسر محروم تھا۔ مرحوم بیسویں صدی کے آغاز میں اسی ویران قصبہ اور اسی غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ غربت ہی کے عالم میں تعلیم و تربیت پائی۔ اور خدا جانے کن مشکل راہوں اور کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں انھوں نے کامیابی حاصل کی، اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ اس مرتبہ پر پہنچ گئے جو دنیاوی حیثیت سے بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ تنہا انھیں کے لئے مخصوص ہو، خدا جانے کتنے افراد اور اس منصب تک پہنچے لیکن ان سب میں انسان کتنے تھے، اس کی جستجو اگر آپ کریں گے تو صرف ایک ہی شخص آپ کو نظر آئے گا جس کا نام "صدیق حسن" تھا۔ وہ جہاں بھی رہے، حاکم کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خادم عوام" کی حیثیت سے رہے اور بلا تفریق مذہب و ملت وہ ہر شخص کے درد دکھ میں شریک ہوئے، ان کی اخلاقی بلندی، پختگی کردار اور ایثار و قربانی کا ثبوت ان کی زندگی کا وہ عجیب و غریب کارنامہ ہے جو ان کے ایک ہندو رفیق سے تعلق رکھتا ہے جو الزام قتل میں گرفتار ہوا اور لفٹیننٹ گورنر کی مخالفت کے باوجود انھوں نے اس کی ضمانت کی۔ مقدمہ کی پیروی پر بے دریغ روپیہ صرف کیا اور جب وہ غریب مر گیا تو اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی۔ مرنے والا کوئی معمولی عہدہ دار نہ تھا، حکومت کے ایک محکمہ کا سکریٹری تھا۔ اور خدا جانے کتنے ہندو اس کے دوست و رفیق تھے، لیکن جب اس غریب پر مصیبت نازل ہوئی تو سب نے منہ موڑ لیا۔ اور صرف ایک مسلمان صدیق حسن نے اس کا آخر دم تک ساتھ دیا اور وہ بھی ان حالات میں کہ گورنر سے لیکر چپراسی تک سب اس کے مخالف تھے، اور مرحوم کی وضعداری کا یہ عالم

تھا کہ خود جیل میں اس کو کھانا پہنچایا کرتے تھے اور کبھی انہوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ اس کا نتیجہ خود ان کے حق میں کیا ہو گا۔ مذہبی حیثیت سے پابند صوم و صلوٰۃ ہونا تو کوئی بات نہیں، لیکن شعائر اسلامی کی پابندی محض تہذیب نفس و اخلاق کی غرض سے، بڑی بلند بات ہے اور مرحوم کی اسی خصوصیت کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک بڑے مسلمان، یعنی ایک بڑے انسان تھے ان کے مکان پر ہر ہفتہ علمی و مذہبی مذاکرے منعقد ہوا کرتے تھے، جن میں میں بھی کبھی کبھی شریک ہوا ہوں اور میں نے ہمیشہ یہ دیکھ کر حیرت کی کہ یہ غیر مولویانہ وضع و صورت رکھنے والا شخص کتنا بڑا مولوی اور مولوی سے زیادہ کتنا بڑا انسان ہے۔

مرحوم کا گھر، غریبوں، اور حاجتمندوں کا ماویٰ و ملجیٰ تھا۔ اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمت خلق کے لئے وقف تھا۔ وہ بڑے وسیع المطالعہ انسان تھے اور علم و ادب سے خاص شیفتگی رکھتے تھے، یہاں تک کہ شرکت مشاعرہ کے جواز کے لئے انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا اور اپنی فطری صلاحیت و اہلیت کی بنا پر وہ بہت جلد بہترین شعراء کی صف میں شامل ہو گئے [1]

وہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ایک تقریب تعزیت میں لکھنؤ سے ملتان آ رہے تھے کہ امرتسر اسٹیشن پر دفعتاً ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ اسی وقت ختم ہو گئے۔ ان کی بیگم اور بعض عزیز خواتین اور بھی ساتھ تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہو سکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ امرتسر کے ذمہ دار افسران نے بروقت ان کی کوئی مدد نہیں کی اور بڑی مشکل سے ان کی لاش کو لکھنؤ پہنچایا گیا جہاں ہزاروں ہندو و مسلمان ماتمداروں کے حلقہ میں انھیں عیش باغ میں سپرد خاک کر دیا۔

زمیں کھا گئی۔ آسماں کیسے کیسے

مانی جائسی

جس وقت ڈاکٹر عبدالحسین نے فون پر جناب مانی جائسی کی وفات کی خبر مجھے سنائی مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس خبر کے یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا وہ تقریباً میرے ہمعصر تھے اور [illegible]

---

[1] چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تیرگی حد سے گزرتی ہے جب اندھیاروں کی　　　تب کہیں مہر درخشاں کا پیام آتا ہے
دم بدم گردشِ دوراں کا سلام آتا ہے　　　کبھی اس طرح بھی جینے کا پیام آتا ہے
جب کہیں تذکرۂ جور تمام آتا ہے　　　کیا کہیں آپ سے کیوں آپ کا نام آتا ہے

محبت ننگ دامن بن گئی ہے　　　یہ دنیا سنگ و آہن بن گئی ہے
کئے دیتی ہے بزم دل کو تاراج　　　نگاہِ دوست دشمن بن گئی ہے
جو موج آغوشِ ساحل میں پلی تھی　　　نئے طوفاں کا مسکن بن گئی ہے

مرتے ہیں ہم عشق کی بیگانہ وشی پر　　　جیتے ہیں محبت کے اشارات خفی پر

اہل کشتی خوش نہ ہوں طوفاں اگر کوئی نہیں　　　بارہا بیڑے ڈبو دیتی ہے موج تہ نشیں
بے سہارا ہو چلا تھا کاروانِ زندگی　　　آکے ڈھارس دے گئی اس کی نگاہ خشمگیں
یہ بھی نظارے میری آنکھوں نے دیکھے بارہا　　　آفتاب ابھرا کئے اور ظلمتیں بڑھتی گئیں

میرے ان کے دوستانہ تعلقات قائم تھے جب وہ اور میں دونوں بھوپال میں یکجا ہو گئے تھے، یہ خبر سن کر پچھلے ۵۰ سال کی وہ تمام صحبتیں یاد آ گئیں جو جناب مانی کی ذات ان کی شاعری و خوشدلی سے قائم تھیں۔

وہ جس دور کے شاعر تھے، وہ دور تھا صرف کارآگہانہ شاعری کا اور اس میں بھی وہ خاص امتیاز کے مالک تھے۔ مانی کی شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کے لئے ایک دفتر درکار ہے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ ان سے زیادہ سمجھ کر شعر کہنے والا کوئی دوسرا مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔

شاعری ان کی فطرت تھی۔ اور ان کا ریاض بھی اور ان دونوں کے اجتماع سے جو اسلوب شاعری پیدا ہو سکتا ہے، وہی مانی کی شاعری کی جان تھی۔ شاعری سے ہٹ کر انسان ہونے کی حیثیت سے وہ "صام دہریاں" کے قسم کے آدمی تھے جنھوں نے بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ غیر معمولی پامردی سے کیا، اور دنیا کی کوئی یاس و ناامیدی ان کو کبھی شکست نہ دے سکی۔ ان کے دواوین غزل و قصائد شائع ہو چکے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان کے اعزہ ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی جلد شائع کرنے کی کوشش کرینگے۔

جناب محمد زکریا مائل کا قطعہ تاریخ شکریہ کیساتھ درج کیا جاتا ہے۔

از وفاتِ مانیِ نیکو سیر — حیف ملکِ شاعری ویراں بشد
چوں بہ تنگ آمد ازیں دار ملال — در حضور ایزدِ سبحاں بشد
گفت با مائل سنِ رحلت سروش — حضرت مانی سوئے یزداں بشد

۱۹۶۳ء

شوکت تھانوی

تیسرا سخت حادثہ جس سے میں حد درجہ متاثر ہوا شوکت کی موت تھی۔

یوں تو بظاہر میری اور شوکت کی یکجائی کبھی نہیں ہوئی، لیکن وہ میرے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہے۔ وہ بھی لکھنؤ میں تھے اور میں بھی، لیکن چند دن مل بیٹھ کر زندگی بسر کرنے کی توفیق نہ مجھے کبھی نصیب ہوئی نہ انھیں۔ یوں دید و وادید کے مواقع تو اکثر میسر آئے لیکن اس خیال سے کہ میں عمر میں ان سے بڑا تھا، از راہ اخلاق وہ کبھی "دانشگاف" ہو کر مجھ سے نہیں ملے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے کیا اور کیسا سمجھتے تھے لیکن مجھے فرداً ان سے تعلق خاطر تھا۔ اور ہمیشہ تو نہیں لیکن کبھی کبھی میں ان صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع نکال لیتا تھا جہاں وہ سرگرم تماشہ ہوتے تھے اور میں صرف تماشائی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس قسم کی تفریحی صحبتوں کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو گیا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ "شوکت" کی یہ بذلہ سنجیاں ان کے کسی سخت تلخی احساس کا نتیجہ ہیں، اور میں یہ سوچکر ذرا سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرا یہ وہم دور ہونے لگا اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی زندگی کی راہ متعین کرنے میں خطرات سے جنگ نہیں کی بلکہ اسی کے زیر سایہ اپنے پر و بال نکالے اور ادب کی ایک مخصوص فضا میں "شاہین" کی سی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کے زمانہ میں چند دوسرے بھی "مزاحیہ نگار" اور بھی موجود تھے، جن میں سے بعض متقدم العہد بھی تھے۔ لیکن شوکت کی راہ ان سب سے علیحدہ تھی۔ اور یہ وہ راہ تھی جسے شوکت ہی اختیار کر سکتے تھے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ سب اپنی اپنی جگہ خاص رنگ کے مالک تھے، کسی میں فلسفہ کی جھلک نظر آتی تھی، کسی میں علم و تنقید کی، اور کسی میں صرف پلاٹ و تکنیک کی، لیکن شوکت کی مزاح نگاری ان سب سے الگ شگفتگی بیان و پاکیزگی زبان کی تھی اور اس خصوصیت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ اور شوکت کی یہ خصوصیت کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں اپنے آپ سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ تو خیر کسی کو حاصل

تھی ہی نہیں۔

شوکت نے کتنا بے بہا ذخیرہ "طنز و مزاح" کا اپنے بعد چھوڑا، اس کے تصور سے بھی حیرت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے اور ایسا خلا چھوڑ گئے جس کا پُر کرنے والا دوسرا نظر نہیں آتا۔

ادیب سہارنپوری

پانچواں حادثہ جس سے میں تا دیر متاثر رہا، ادیب سہارنپوری کی موت تھی۔ اول اول ان کا قیام اندور میں تھا اور کانگرس کے پُرجوش حامی تھے، لیکن تقسیم ہند کے بعد انھیں خود اپنے رفقاء کی طرف سے ایسے صدمے پہنچے کہ وہ بلبلا اٹھے اور مجھے ایک طویل خط لکھکر مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ اس سے پہلے وہ ایک بار لکھنؤ آکر مجھ سے مل بھی چکے تھے اور میں ان کے ذوقِ تغزل کو بہت پسند کرتا تھا۔ میں نے انھیں رائے دی کہ وہ اندور چھوڑ دیں اور بیشک پاکستان چلے جائیں جیسا کہ خود انہوں نے بھی ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ وہ تقسیم ہند کے کچھ دن بعد کراچی چلے آئے اور یہاں ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی جگہ الگ بنالی۔ ان کی شاعری خالص جذبات کی شاعری تھی، اور اپنے مخصوص اندازِ بیان کی بنا پر "نشتر ہی نشتر"۔ غالباً اس لئے کہ وہ شاعر سے زیادہ انسان تھے اور ان کا حسن فطرت ہی ان کے کلام میں بھی منتقل ہو گیا --- اس سے قبل جب کبھی میں عارضی طور پر کراچی آیا تو وہ ہمیشہ مجھ سے آکر ملے۔ لیکن جب میں مستقل قیام کے ارادے سے یہاں آیا تو وہ خود رخصت ہو گئے۔ اور اپنی سوگوار زندگی کا صرف یہ نقش چھوڑ گئے کہ

تا بمانیم زندہ بر دوزیم — جامۂ کز فراق چاک شدہ
ور بمیریم عذرہا داریم — اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

نظر حیدرآبادی

آخری حادثہ جس نے مجھے کئی دن تک افسردہ و مضمحل رکھا نظرؔ کا انتقال تھا۔ مرنے سے شاید دو ہفتہ قبل آکر مجھ سے ملے تھے اور یہ وعدہ کر گئے تھے کہ اپنے والد مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام آئندہ جمعہ کو لیکر آئیں گے لیکن وہ "آئندہ جمعہ" انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

نظرؔ کے والد جناب علی اخترؔ مرحوم میرے ان چند مخلص احباب میں سے تھے جن کے خلوص و صداقت پر مجھے ہمیشہ ناز رہیگا اول اول سنہ ۳۳ء میں ان سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی اور شاعر و انسان دونوں حیثیتوں سے وہ مجھ پر چھا گئے۔ یہ موقع ان کی ذات یا ان کے فن پر اظہارِ خیال کا نہیں کہ اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ وہ تو اس وقت صرف اس لئے یاد آگئے کہ وہ نظرؔ کے والد تھے اور سب سے پہلے میں نے نظرؔ کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ بالکل صاحبزادے تھے اور شاعر بھی نہ تھے۔ اس کے بعد جب ان کا خاندان پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد سے کراچی آگیا تو نظرؔ کی شاعری میں جگمگاہٹ پیدا ہوئی۔ اور یہ روشنی تیز تر ہو گئی حتیٰ کہ ان کا شمار یہاں کے صف اول کے شعراء میں ہونے لگا۔ افسوس کہ وہ کراچی آنے کے بعد بھی زندگی کی مشکلات سے دوچار رہے لیکن آخیر وقت تک انہوں نے اپنے شاعرانہ وقار کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنے مداحوں کی ایک بڑی جماعت اپنے بعد چھوڑ گئے۔

ہندوستانی خریدارانِ نگار پاکستان

اپنا سالانہ چندہ دس روپے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرماکر رسید ڈاکخانہ مع خریداری نمبر براہ راست ہمارے پاس بھیج دیں!

علی شیر خاں۔ محلہ کھترانہ کلاں۔ رائے بریلی

نگار پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر
جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
قیمت :- تین روپے

نظیر نمبر
جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی تغزل ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صنائع و طبائع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔
قیمت :- تین روپے

مصحفی نمبر
جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء دادبار اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔
قیمت :- تین روپے

غالب نمبر
جس میں مرزا غالب کی فارسی و اردو شاعری کی خصوصیات کو بالکل نئے زاویہ سے پیش کیا گیا ہے۔
قیمت :- پانچ روپے

ہندی شاعری نمبر
جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔
قیمت :- چار روپے

نیاز نمبر
جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب نے حصہ لیا ہے۔ اس میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو پر مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافی زندگی، شاعری و ادارتی زندگی ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفحات ۶۲۴ - قیمت :- آٹھ روپے

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

میرا نظریۂ شعر اور میری شاعری

گذشتہ سے پیوستہ

جمیل مظہری

مبالغہ بھی شاعری کے لئے ایک سنگار ہے لیکن اس کے لئے بھی ایک سلیقہ چاہیئے۔ دنیا کے شاعروں میں عرفی سے زیادہ کسی نے مبالغہ نہیں کیا ہوگا لیکن اس کا کوئی مبالغہ بھی شاید حسن سے خالی نہیں۔ اور الفاظ و افکار کا حسن ہی شاعری کی جان ہے۔ آمدم بر سرِ مطلب۔ بات کہاں سے کہاں پھیل گئی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ زندگی کے مسلمہ اور پیش پا افتادہ حقائق شاعر کی زبان پر پہونچ کر کس طرح سحر انگیز بن جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت سے اس بحث پر خود بخود روشنی پڑ رہی ہے۔ بات کتنی ہی خشک اور بے مزہ کیوں نہ ہو شاعری اس میں اپنی حسن آفرینی سے کچھ اس طرح شیرینی اور رس گھول دیتی ہے کہ سامعہ لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاعر کا یہی سلیقہ اس کی شاعری کو پیغمبری بناتا ہے اور اس پیغمبری کا راز اس کی قوت متخیلہ کی اکتشافی اور انکشافی جد و جہد سے زیادہ اس کی قوتِ ناطقہ کی حسن آفرینی میں ہے۔ حسن کیا ہے ایک لمبی بحث ہے۔ حسن جو کچھ ہو لیکن اس کا مظاہرہ جسموں اور صورتوں ہی میں نہیں فکر و عمل میں بھی ہوتا ہے۔ نقوش و خطوط میں بھی اور صوت و آہنگ میں بھی۔ چنانچہ ہمارے تمام فنونِ لطیفہ اسی تخلیق حسن کی کوشش کی ایک تاریخ ہیں۔ مصور جس طرح نقوش و خطوط میں حسن کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح عمل میں بھی ایک حسن ہوتا ہے جسے مذہب اور فلسفۂ اخلاق کی زبان حسنِ عمل کہتی ہے۔ شاعری حسنِ خیال ہے صرف حقیقت نگاری شاعری نہیں کہی جا سکتی۔

دندان تو جملہ در دہاں اند
چشمان تو زیر ابر دانند

اس سے زیادہ حقیقت نگاری اور کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ ایک ایسی حقیقت نگاری ہے جو حسن بیان سے خالی ہے۔

بعض سطح پرست ذہن حسن اور رنگینی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں لیکن حسن آفرینی کے لئے رنگینی لازمی نہیں بعض اوقات سادگی سے بھی حسن پیدا کیا جا سکتا ہے کیونکہ بقول آتش ؏

"تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی"

ہماری شاعری میں اس کی بہترین مثال اسماعیل میرٹھی کا آرٹ ہے۔ لیکن سادگی کے ساتھ رنگ آمیزی

بھی اعتدال کے ساتھ شاعری کے لوازم میں سے ہے مگر موقع و محل کے لحاظ سے رنگ کا انتخاب بھی ایک بڑا سلیقہ چاہتا ہے جس کی طرف انیسؔ یوں اشارہ کرتے ہیں

تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے

اور اپنے اس قول کی مرشدِ شیراز سے اس طرح تصدیق کراتے ہیں :-

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

کلام میں حُسن اعتدال پسندی اور موقع شناسی سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کو اس کا سب سے زیادہ لحاظ عبارت کے بندوبست اور لفظوں کی معنوی بندش میں رکھنا چاہیئے۔ آتش اس سعی کو نگینہ سازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ گو خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ شاعری ہی میں کیا جملہ فنون میں یہی موقع شناسی کا شعور ایک فنکار کو عظیم سے عظیم تر بناتا ہے ؎

"یعنی موقع ہو جہاں جسکا عبارت ہو وہی"

حقیقت یہ ہے کہ حقیقت اپنی جگہ بے رنگ اور بے آہنگ ہے۔ اس کا اظہار کرنے والی زبانیں اپنے مزاج کے مطابق اس میں رنگ اور آہنگ پیدا کرتی رہتی ہیں۔ ایک حقیقت کے اظہار کے لئے فلسفی کا انداز بیان کچھ اور ہوتا ہے اور واعظ کا کچھ اور، اور شاعر کا سب سے جداگانہ۔ شاعر اگر فلسفی کا اسلوب اٹھا لیتا ہے تو اسکے بیان کی شعریت وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جرم ہمارے سب سے بڑے شاعر غالبؔ سے اکثر سرزد ہوا ہے۔ میرؔ کو اس نسبت خاص میں غالبؔ پر اسی لئے فوقیت ہے کہ ایک خُشک حقیقت کے اظہار میں بھی وہ اپنی زبان اور اپنے بیان میں فلسفہ کی خشکی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ حیات کی بے بقائی اور حُسن کی بے ثباتی ایک خشک بے مزہ اور ناگوار موضوع ہے۔ واعظ کا لب و لہجہ اس کو اور ناگوار بنا دیتا ہے لیکن شاعر کی زبان سے وہ کیونکر گوارا ہو جاتا ہے یہ میرؔ سے پوچھیئے :-

کہا میں نے کتنا ہے گُل کو ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

اسی تبسم کی ایک حسین تشریح جوشؔ کی زبان سے بھی سُن لیجئے :-

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
تو ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

ہمارے موجودہ شعراء میں جوشؔ کو لفظوں کی طلسم بندی اور بندش کی تکلفات کے اعتبار سے عہد حاضر کا ناسخؔ کہا جاتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ عہد حاضر کے اس ناسخؔ نے زبان و بیان میں حُسن کی تخلیق بھی سب سے زیادہ کی ہے ان کی ایک اور رباعی ہے جو موضوع کی خشکی میں شعریت کی رنگ آمیزی کی ایک بہترین

مثال ہے۔ یہ رباعی آپ کو اس لئے سناتا ہوں کہ اس سے ہمارے موضوع گفتگو پر مزید روشنی پڑ رہی ہے۔

دے جام کہ ہوتا ہے سویرا ساقی
مشہور ہے اعتدال میرا ساقی
وہ غیبت نور ہو کہ طغیانیٔ نور
دونوں کا نتیجہ ہے اندھیرا ساقی

مذکورہ بالا مباحث میں سحر آفرینی کی جو مثالیں گنوائی گئی ہیں انھیں میں شاعری کی جان سمجھتا ہوں اور یہی وہ روح سخن ہے جس کی کمی میں اپنے اشعار میں پاتا ہوں اور جس کا سراغ آپ کو جوش و جگر کے بعد میرے ہمعصروں میں سب سے زیادہ آل احمد سرور اور پرویز شاہدی کے یہاں ملے گا۔ گو پردے کے اس پار کی باتیں ہم پرویز سے زیادہ اجتبیٰ رضوی سے سنتے ہیں لیکن اجتبیٰ موضوع کی عظمت اور زبان کی لطافت میں وہ توازن قائم نہیں رکھ سکتے جو شاعر اور فلسفی میں امتیاز پیدا کرتا ہے بہرحال مقام شکر ہے کہ اجتبیٰ اور پرویز کے نقوش قلم کی رہنمائی میں ہمارے صوبے کی نئی ادبی پود کے اندر فکر و فن کا شعور بڑی تیزی سے بالیدہ ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کاروان اور آگے بڑھے اور ہم لوگ گرد کارواں بنکر زبانِ حال سے یہ کہتے رہیں کہ

خارہا از اثر گرمی رفتارم ساخت
منت ہر قدم راہ روا نست مرا

اب رہا یہ فریضہ کہ میں نے جس نظریہ شاعری کی اتنی لمبی چوڑی وضاحت کی اس کے ماتحت اپنے کلام کا خود جائزہ لوں تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ قرآن حکیم نے شاعروں پر یہ تعریض کی ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ میری شاعری میرے نظریۂ شاعری کی روشنی میں حرف بحرف اس تعریض کی مستحق ہے نہ میں نے جذبات کی دنیا میں کسی نئے جذبے کا سراغ لگایا اور نہ کسی معلوم جذبے کی کامیاب ترجمانی کی۔ میرے شعور نے نہ کبھی فطرت کے دل کی دھڑکنیں سنیں نہ اپنے افکار پریشاں میں حسن کی تخلیق کا حق ادا کیا۔ زیادہ سے زیادہ میرا سرمایۂ فن یہ ہے کہ جب مجھے شعور ذہنی حاصل ہوا تو میں نے غزل کے معنوی حدود سے حسن و عشق کے فرسودہ تصورات کو خارج کرنے کی کوشش کی لیکن ایام شباب میں ایک دور ایسا بھی مجھ پر گزرا ہے جب میں نے مومن کے فطری اور متوازن تغزل کی تقلید کرنی چاہی اور چند غزلیں بھی لکھیں مثلاً

ہے تیرے ناوک تشنہ سے مجھ کو ہمدردی
کہ اب کوئی دلِ نا مبتلا نہیں ملتا
جمیل کے لئے بے چین ہے نظر ان کی
پھر آج بزم میں وہ بے وفا نہیں ملتا

لیکن چونکہ زندگی میں جنسی معاشقہ کا کوئی ذاتی تجربہ مجھے حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے مومن کی تقلید کا یہ جذبہ بار آور نہ ہوسکا۔ غزل گوئی میں میری ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ میں نے عشق کے جذبہ کو شاعروں اور صوفیوں کی طرح کبھی کوئی محترم جذبہ نہیں سمجھا۔ میری اجتماعیت پسندی نے جب اپنے نقطۂ نظر سے اس جذبے کی تحلیل نفسی کی تو مجھے یہ جذبہ بھی انفرادیت پسندی کا ایک بگڑا ہوا بھیس نظر آیا جو اپنی غرض کی دھن میں کبھی کبھی اس غرض سے

بھی انکار کر جاتا ہے جو اس کے وجود کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ اس جذبہ کی توہین و تضحیک آپ کو میری غزلوں میں جگہ جگہ ملے گی۔

کچھ سوچ تو دل لگانے والے
خواہش کو مرض بتانے والے

ستم ہے یہ ذوق پُر فشانی کہیں نہ بجھ جائے شمع محفل
کوئی پتنگوں سے آکے کہدے کہ یہ ہوس ہے، وفا نہیں ہے
اسی کا ہے نام اگر محبت تو کس کو کہتے ہیں خود پرستی
اک ایسی دنیا بنا رہا ہوں جہاں کوئی تیسرا نہیں ہے

ایمان وفا جس کا عشقیہ شاعری میں صدیوں سے پروپیگنڈا ہو رہا ہے میری نظر میں اس کی وقعت اس سے زیادہ نہیں کہ:۔

"حُسن پر عشق کا اک جبر وفا جس کو کہیں"

تجھ سے عاشق کی خودی مانگ رہی ہے تجھ کو
عشق کا حُسن تقاضا ہے وفا کچھ بھی نہیں

یہی وفا کبھی کبھی مجھے جذبہ جنسی کی ایک تھکن سی نظر آئی اور میں نے بڑے سہمے ہوئے انداز میں اعلان بھی کیا:۔

"شوق کی اک خستہ حالی کو وفا سمجھا تھا میں"

عشق ہی پر کچھ منحصر نہیں غالب کے دبستانِ فکر و فن میں مدتوں طالب علمی کرکے میں نے ہر جذبے کی تحلیل اور ہر کیفیت کے تجزیے کا شعور حاصل کیا۔ اس شعور کا پتہ بھی آپ کو کہیں کہیں میری شاعری میں ملے گا۔

اک اضطراب کو شوخی سمجھنے والی آنکھ
ادا شناس حجابات دلبری نہ سہی

اضطراب خود نمائی کو حیا سمجھا تھا میں
وہ نگاہِ ناز کیا کہتی تھی کیا سمجھا تھا میں

اخلاق ہے کیا خدا کے بندوں سے فریب
دینداری ہے کیا خدا سے دنیا داری

میرے تغزل میں جو سوز و گداز کی کمی ہے میری شاعری میں جو رنگ اور رس کا فقدان شاید اس کی ذمہ دار میری یہی عادت ہے جو مجھ سے ہر غم اور ہر خوشی کا بخیہ ادھیڑواتی رہتی ہے خصوصیت کے ساتھ غم عشق کا جو اپنی تمام

بے پناہیوں کے ساتھ کبھی مستقلاً مجھ پر مسلط نہیں ہوا۔ اور ظاہر ہے کسی جذبہ کا غلبہ ہی شاعر کے ذہن میں وہ انفعالی کیفیت پیدا کرتا ہے جس نے میر کی شاعری کو نشتر زار بنا دیا۔ غالب کی غزلیت باوجود کوشش کے اس کیفیت سے کیوں خالی رہی اس کا سبب آپ کو غالب خود بتا رہے ہیں ؎

"عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ"

ابتدائے شباب میں میری طبیعت نے بھی وحشت کا یہ رنگ عارضی طور پر پکڑا تھا یہ وہی دور ہے جب میں نے حضرت وحشت کی شاگردی اختیار کی مگر استاد کی ہمت افزائی کے باوجود یہ رنگ پوری طرح میری طبیعت میں رچ نہ سکا۔ تقریباً اسی زمانے میں جب مجھ میں قومی احساس پیدا ہو رہا تھا تو میں نے فارسی قوام اور ہندی رس کی آمیزش سے تغزل کا ایک مرکب تیار کیا اور اس کا نام رکھا پریم گیتا۔ یہ رنگ ابھی پوری طرح نکھرا نہ تھا کہ طبیعت کا تلون دوسری سمتوں بہک گیا۔ بہر حال چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

رندھی ہوئی ہیں نشیلی آنکھیں گلابی چہرہ اُترا ہوا ہے
پپیہا بولا، ڈھل آئے آنسو، کنواری رادھا کو کیا ہوا ہے

کل رات نبض فطرت کچھ تیز چل رہی تھی
دو دل دھڑک رہے تھے جنگل کی خامشی میں

جب گاؤں کی چنچل رادھائیں پنگھٹ کی اور کو جاتی ہیں
تب سائے دھانی ہوتے ہیں تب دھوپ گلابی ہوتی ہے

فارسی تغزل کو ہندی تغزل کے سانچے میں اتارنے کا تجربہ بھی ملاحظہ ہو۔ سعدی کا ایک شعر ہے:۔

ساربان آہستہ رو کارام جاں در محمل است
اشتراں را بار بر پشت است و بارا بر دل است

میں نے اس کا ٹھیٹ ترجمہ ہندوستانی تغزل میں یوں کیا۔

جو بوجھ کہ میرے دل پر ہے وہ بوجھ کہاں ہے بیلوں پر
اے بہلی والے تیز نہ چل اس میں رادھا بھی میری ہے

لیکن افسوس کہ میرے احساس کمتری نے ان پیاری پھوروں کو بھی چوم کر چھوڑا۔ میں نے بہت جلد یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اس رنگ میں جس حد تک تخلیق حسن کی ضرورت ہے اس کا شعور مجھے ودیعت نہیں کیا گیا اپنے کلام میں رعنائی اور رس پیدا کرنے کے سلسلہ میں میری اس بے بسی کی نفسیاتی وجہ شاید یہ ہو کہ حسن کو قریب سے دیکھنے اور اس کے خد و خال کے جائزہ لینے کا موقع زندگی نے مجھے کبھی نہیں دیا۔ میں سراب کے پیچھے دوڑا اور بہت جلد اپنی تشنگی پر قانع ہو گیا۔ قناعت نے جو زاہدانہ یبوست میرے دماغ میں پیدا کی اس کا اثر میرے بارہ ہائے فن میں بھی جا بجا نمایاں ہو کر رہا۔ شاید یہی حادثات تھے جن کی بنا پر میری شاعری وارداتِ قلبیہ کی نگارش سے بھی قاصر رہی۔ میری غزلوں کا سرمایہ میرے چند ایسے الجھے ہوئے افکار ہیں جنہیں آپ نواب امداد صاحب اثر کی زبان میں امور ذہنیہ کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ ان امور ذہنیہ کو تغزل کا پیرایہ عطا کروں لیکن یہ سلیقہ مجھ میں کبھی نہیں

آیا۔ میرا ایک مطلع جو تنہا میری شہرت کا ذمہ دار ہے

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

تغزل کی لطافت اس شعر کے دوسرے مصرع کا تحمل تو کرے گی لیکن "بقدر پیمانۂ تخیل" نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کا اسلوب۔ یہ غزل ۱۹۳۰ء کی کہی ہوئی ہے اب آپ ملاحظہ کریں کہ اس تیس تبیس سال کے عرصہ میں بھی میں اپنی زبان کو غزل کے مزاج کے مطابق نہ بنا سکا۔ اب تو یہ حال ہے کہ میں کسی خوش ذوق آدمی کو اپنی غزل سناتے شرمندہ ہوتا ہوں۔ میری تازہ ترین غزل کے دو اشعار ہیں۔

ہر حال میں صنم ہے جس دائرہ میں رکھو
یا عرش پر بٹھاؤ یا بت کدہ میں رکھو
تعبیر ہی غلط ہے جس زاویے سے دیکھو
تصویر ہی غلط ہے جس چوکھٹے میں رکھو

آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ان اشعار میں کہیں سے تغزل کا رس موجود ہے اس غزل کا ایک اور شعر بھی ہے جو بجائے خود میری غزلیت پر طنز ہے:۔

واعظ کی ذہنیت کا سانچہ یہی رہے گا
یا بت کدہ میں لاؤ یا گل کدے میں رکھو

ہر شاعر کے لئے اپنا کلام حسنِ طبیعت ہوتا ہے لیکن اگر یہ بھی خودستائی نہ ہو تو میں یہ عرض کردوں کہ شاعری میں خودستائی اور خودلپسندی کا مجرم میں کبھی نہیں رہا مجھ میں یہ نفسیاتی کمزوری ایک لمحہ کے لئے بھی پیدا نہیں ہوئی اور میں نے ہمیشہ کھلے دل سے یہ اعتراف کیا کہ

جمیلؔ اس غزلیت کا فائدہ کیا ہے
جو فلسفہ نہ بنی اور شاعری نہ بنی

اس طرح نظموں میں میری قدامت پرستانہ روش نے نئے اسالیب کی ندرتوں کو قبول نہیں کیا اور زیادہ سے زیادہ اقبال کی تقلید کی۔ لیکن میری ذہنیت کا سانچہ علامہ موصوف کے سانچہ سے جدا گانہ تھا۔ اس لئے اس تقلید کا حق بھی پوری طرح ادا نہ ہو سکا اور کلام کا یہ رنگ ہوگیا

فسانہ چاہیئے اس چشم سحر فن کے لئے
غرورِ خودگری نازِ خود شکن کے لئے
کرے جو خوں سے فراہم نمو چمن کے لئے
دلوں میں سوز بھرے گرمیٔ سخن کے لئے
ہزار شمع جلائے اک انجمن کے لئے
اٹھی جو سینۂ فطرت سے موجِ وجدانی
ملی خلش کو حلاوت تپش کو تابانی

ظہور حسن نے کی ہر طرف درخشانی
نظر جو آئی اجالے میں اپنی عریانی

حقیقتیں ہوئیں بیتاب پیرہن کے لئے

ایک فن کار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے فن کے سلسلہ میں اپنے نقادوں کی صحیح رہنمائی کرے۔ اس لئے یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ علاوہ نظموں اور غزلوں کے میں نے مراثی، قصائد اور مثنوی میں بھی اپنی طبیعت کا حتی الوسع امتحان لیا اور بہت جلد اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ ان اصناف میں جس فنکارانہ صلاحیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں شاید موجود نہیں۔ اپنی شاعری کے سلسلہ میں میرے اندر جو ایک احساس کمتری ہے شاید وہ میرے معیار کی بلندی کا نتیجہ ہو۔ اپنے معیار کی بلندی سے جب میں اپنے کلام کو دیکھا تو مجھے اس کی پستی کا ایماندارانہ احساس ہوا جینے کے لئے تھوڑے سے غرور کی بہرحال ضرورت ہوتی ہے اس لئے مجھے یہ سمجھنے دیجیے کہ ارتقا کی راہ میں میرا ذوق اس تیزی سے آگے بڑھا کہ میری ذہنی صلاحیت اس کا ساتھ نہ دے سکی اور پیچھے رہ گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر شعبۂ فن میں اپنی ناکامی کے باوجود میں شعر کہتا کیوں ہوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میرا ایک نفسیاتی مرض ہے جس کے دورے مجھ پر کبھی کبھی پڑتے ہیں اور مجھے خود معلوم نہیں کہ کیوں پڑتے ہیں۔ میرے مہربان نقادوں نے اپنے قلم کے نشتر سے میرے ذہن کے اس مادۂ فاسد کو نکالنے کی ہر چند کوشش کی لیکن ؏

مریض عشق پر رحمت خدا کی

میں نے بھی اپنی جگہ اس مرض سے شفایابی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن فائدہ خاطر خواہ نہ ہوا اگر آپ کے پاس اس بیماری کے دفعیہ کا کوئی تیر بہدف نسخہ ہو تو میں بڑے شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کروں گا۔

چائے کا رواج

کہا جاتا ہے کہ تیمور لنگ (۱۳۳۶ - ۱۴۰۵) کے عہد سے چائے کا رواج ہوا ورنہ اس سے پہلے بہت کم لوگ اس کے استعمال سے واقف تھے۔ وہ اس طرح کہ ایک مرتبہ اس کی فوج میں وبا پھیلی اور اس کے تدارک کے لئے اس نے سختی سے حکم دیا کہ پانی ابال کر پیا جائے۔ چونکہ ابلا ہوا پانی بد ذائقہ ہوتا ہے اور فوجی اس کو پینے میں پس و پیش کرتے تھے اس لئے اس کو خوش ذائقہ بنانے کے لئے تیمور لنگ نے چائے دریافت کی اور اس کی پتی کو پانی میں ملا کر استعمال کیا جانے لگا۔

پنگھٹ پر

(شعرِ منثور)

نیاز فتحپوری

وہ شبنم سے بھیگی ہوئی، برگ پوش گلاب کی کلی، جس کی سرخ لکیر پتیوں کے خط انفصال پر ایسی نظر آ رہی ہے، جیسے کسی کا محرم مسک جائے ——— تم نے دیکھی؟

وہ قوس قزح جس کی رنگینیاں، ایک والہانہ پاکیزگی، ایک سماوی لحن کے ساتھ، بہار کی دیوی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے ——— تم نے دیکھی؟

سمندر کا وہ جوش، جیسے کسی کا سینہ انتہائی ہیجان کے عالم میں تنفس کی شدت سے بے قابو ہو کر سمٹ سمٹ کر پھیل رہا ہو ——— تم نے دیکھا؟

ماہ کامل کا وہ عروج نیم شبی، جو دنیائے شباب کو اپنی آبشار سیمیں کے لطیف نغموں سے مست و سرشار بنا کر باغ کے کنجوں میں دعوت سرگوشی سے بیتاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا؟

شہاب ثاقب کی وہ روشن لکیر، جو سرعت برق کے ساتھ فضا میں بلند ہو کر، ایک طرۂ زرکار بناتی ہوئی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے ——— تم نے دیکھی؟

صبح کے وقت افق کی وہ زر اندود کیفیت، جیسے کسی نے سونا پگھلا کر چاروں طرف پھیلا دیا ہو ——— تم نے دیکھی؟

اپریل میں کوہستان کشمیر کی وہ گل پوشیاں، جو برف پگھلنے کے بعد زمین کے اندر کی تمام مخفی رنگینیاں اور عطر بیزیاں لئے ہوئے چاروں طرف ایک افسوں سا پھونک دیتی ہیں ——— تم نے دیکھیں؟

تاتار کا وہ غزال رعنا جو اپنے مشکنافہ کی نکہت سے مست ہو کر، صحرا کی پریوں کو سپردگی کی کیفیت سے بے تاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا؟

تم نے باغ کی کسی فصیل پر طاؤس کو اپنی مستانہ آواز دلوں میں پیوست کرتے دیکھا ہے۔؟

تم نے کبھی اس پر شور آبشار کو دیکھا ہے جو پہاڑ کی بلندی سے گرتے ہوئے صحرا کو ایک ہنگامۂ لطیف سے لبریز کر دیتی ہے؟

یقیناً تم نے یہ سب مناظر دیکھے ہوں گے، لیکن کیا تم نے ان تمام کیفیات کو ایک جگہ، کسی ہستی میں مجتمع دیکھا ہے۔

اگر نہیں تو تم اس شکستہ حال، غریب الدیار، آوارہ گرد شاعر کے حال سے تعرض نہ کرو، جس نے سب سے پہلی بار ان سب کا اجتماع پنگھٹ پر ایک پانی بھرنے والی دہقانی لڑکی کے اندر دیکھا اور ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔

ادب اور اخلاق

ڈاکٹر سید محمد یوسف

پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ "ادب کس کو کہتے ہیں؟" اجنبی ناقدوں سے استشہاد میرے لئے چنداں دشوار نہیں لیکن میری کوشش یہی ہوگی کہ اس بارے میں اپنی مشرقی روایت پیش کروں۔ ہماری اپنی روایت یہ ہے کہ شعر و ادب دونوں "جزوے است از پیغمبری" ادب وہ ہے جو بہتر زندگی کے طور طریق سکھائے۔ جو حسن و جمال کی قدر بڑھائے اور اس کا احترام سکھائے نہ وہ جو چیرہ دستیوں سے حسن و جمال کی رسوائی کرے۔ ہمارے یہاں جذبات کے اظہار میں بے اعتدالی کا نام "بوالہوسی" ہے۔ ہماری طبع جذبات کی روک تھام سے رواں ہوتی ہے۔ ادب کا اولین مقصد ضبطِ نفس اور جذبات کی تہذیب و تطہیر ہے۔ اسی لئے مادی عروج کے دور میں صالح ادب کی ضرورت شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ دولت مند اور طاقت ور کی بے ادبی خاص طور پر بدنما ہوتی ہے اور بشریت کے لئے نہ صرف باعثِ ننگ بلکہ باعثِ آزار بھی ہوتی ہے۔ پیغمبری 'زمانہ ستیزی' ہے 'زمانہ سازی' نہیں، ادب محض ایک آلہ تصویر نہیں جو واقع و معروض بے ادبی اور عریانی کی عکاسی کرے بلکہ وہ ایک طنزیہ تصویر (کیریکیچر) ہے جس کا ہر خط تحسین و تقبیح کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے اور یہی تحسین و تقبیح ادیب کے آئیڈیل اور اس کے مقاصد کی گہرائی وسعت اور بلندی کا پتہ دیتی ہے آئیڈیل کے ابعاد ثلثہ ہی سے ادیب کا قد و قامت اور اس کا رتبہ و مقام متعین ہوتا ہے ادیب اپنی فنکاری کے لئے جن معروضات، مشاہدات اور تجربات کا انتخاب کرتا ہے ان کی بھی اہمیت یہی ہے کہ یہ انتخاب اس کے دل کا معاملہ کھولتا ہے۔ فن کار جیتی جاگتی بولتی تصویریں تخلیق کرتا ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ تصویریں اپنی بابت کچھ نہیں بولتیں وہ جو کچھ بولتی ہیں اس کا تعلق سراسر فن کار کے فکر و نظر سے ہوتا ہے۔ ایک فنکار کے ہاتھ میں حیوانات، جمادات پتھر، پہاڑ، دریا سب بولتے سنائی دیتے ہیں لیکن ان کے بول ہر حال میں فن کار ہی کے بول ہوتے ہیں۔ قرآن میں شہد کی مکھی وحی کے اسرار و انکشاف کرتی ہے "لطف" کی بات اور ہے، اس کا دار و مدار پڑھنے سننے والے کے مذاق کی صحت اور مرض پر ہے البتہ ادب کی قلب ماہیت زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی۔ مشرقی روایت میں الف لیلہ کو کبھی ادب کے دائرہ کے اندر نہیں آنے دیا گیا۔ یہ ادب کے محیط کے گرد ہی چکر لگاتی رہی۔ کسی مدرسہ میں نہیں پڑھی پڑھائی گئی۔ یہ نامعلوم نصف تعلیم یافتہ قصہ خوانوں کے دماغ کی پیداوار ہے جس میں غیر متعلم جماہیر کے لطف و تفریح کی رعایت کی گئی ہے وہی حال جو آج ہماری صنعت فلم سازی کا ہے۔ یہ سراسر فسانہ ہے جس میں

رنگین خطوط کو بالقصد رنگین تر بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس دور کی اجتماعی حالت کا آئینہ دار سمجھنا بھی غلط ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے مثال موجود ہے کہ پاکستانی معاشرہ کہیں ارفع و اعلیٰ ہے ان تصویروں سے جو ہماری بنائی ہوئی فلمیں پیش کرتی ہیں اس کو ادب میں جگہ دینا بجز اس کے نہیں کہ مغربی مستشرقین کا ایک جھوٹا احسان ہے جس کو ہم اپنی غلامانہ ذہنیت کے مطابق قبول کئے جا رہے ہیں۔

تحسین و تقبیح کا معیار جس کا اوپر ذکر ہوا نقدِ ادب کی قدیم عربی روایت کا اصل اصول ہے ایک موٹی مثال ہے کہ اگر کسی شاعر نے اپنے سیاہ فام معشوق کو حسین کر دکھایا تو کہا جائے گا کہ اس نے فن کا حق ادا کر دیا۔ جمالیات کی حد تک تو اس کی بڑی گنجائش ہے اور فن کار اپنے اس عمل میں سچا اور مخلص بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس کا تعلق تمام تر ذوق سے ہے جو کسی ناپ تول کے پیمانہ کا پابند نہیں۔ آپ دیکھئے لباس، سنگھار اور سجاوٹ کے طریقے ہر ملک اور ہر زمانے میں مختلف ہوتے ہیں کسی طرح لازم نہیں آتا کہ ہم میں سے ہر ایک "خال ہندو" پر سمرقند و بخارا بخش دے۔ ہر مجنوں کی لیلےٰ ایک ہی سانچے کی ڈھلی ہوئی نہیں ہوتی۔ آج جب دوشیزۂ عالم کی کمر اور سینہ کے اُبھار کو فیتے کی گرفت میں کسا جاتا ہے اور انچ اور ملی میٹر میں ناپا جاتا ہے تو مجھے بے ذوقی بھی معلوم ہوتی ہے اور بے عقلی بھی۔ کاہے کو کبھی حُسن نے اقلیم دل میں داخل ہونے کے لئے اس قسم کا پاسپورٹ حاصل کرنے کی ذلت و رسوائی قبول کی ہو گی۔ کیا کہا جائے اس معاشرہ کو اس کلچر اور اس علم و فن کو جو جان و دل کے معاملہ کو ایک ریاضی اور مساحت کا مسئلہ بنا کر دماغ میں ٹھونسنے کہتے ہیں ہر چیز انتہا کو پہونچ کر اپنی ضد میں بدل جاتی ہے۔ بیسویں صدی میں شاید عقل اور عقلیت پسندی کا یہی حال ہے۔ الغرض جمالیات میں تو یہ سب کچھ روا ہے لیکن اخلاقیات کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی فنکار سیاہ اعمال کو اپنی تحسین کا موضوع بنائے تو اس فن کو، خواہ اس میں کتنی ہی نفیت کیوں نہ پائی جائے اعزاز نہیں بخشا جا سکتا۔ ایسی تحسین بذاتِ خود قبیح ہو گی اور اس کی مثال ایسی ہو گی جیسے کوئی چوری اور دیگر جرائم کی تدبیر میں سائنسی مہارت کا مظاہرہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی قدریں اٹل اور عالمگیر ہوتی ہیں ان کے حسن و قبح میں افراد کی پسند اور شخصی مزاج کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کی تائید دین سے بھی ہوتی ہے اور عقل سے بھی۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ زاہد پر پھبتی ہمارے ادب کی ایک قدیم روایت ہے پھر آج دین کی تضحیک پر کیوں ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے؟ شوخیٔ طبع اور رنگینیٔ تشبیہات و استعارات کا حق نکال لینے کے بعد بات کچھ ایسی ہی رہ جاتی ہے جیسے ہمارے ذکی الحس طالب علم اپنے بعض اساتذہ کے بناوٹی انداز اور ادعاءِ علم کا مذاق اڑاتے ہیں اور تربیت اور ڈسپلن میں حکمت اور موعظت حسنہ کی کمی سے نالاں رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نالہ اور وہ بھی نوجوانوں کا نالہ، پابند لے نہیں ہوتا لیکن اس میں علم کی بے قدری اور بے عزتی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف حال مست صوفی تھے جنھوں نے دین کی ضرورت اور دین کے نظام کو اپنی تعلیوں کا نشانہ بنایا چنانچہ ان کے شطحیات وہ آخری قطرہ ثابت ہوئے جس سے معاشرہ کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور قصۂ دار و رسن سے کان آشنا ہوئے اور یہاں یہ بھی کوئی زبردستی نہیں بلکہ نہایت معقول بات ہے کہ اس بارے میں کہنے والے کی نیت اور اس کی سیرت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ اپنے اوپر قیاس کیجئے جن دوستوں کے خلوص پر اعتماد ہوتا ہے ان کی چوٹیں کھا کر لطف حاصل

ہوتا ہے ۔ اس کے برخلاف اگر نیت ہیں شبہ ہو تو ذرا سی بات بھی بری لگتی ہے ۔ باحضوری کی شوخیوں کو بےحضوری کی ڈینگوں سے تمیز دینا معمولی سمجھ اور ادبی ذوق کی بات ہے ۔

تحسین و تقبیح ایک ایسا عمل ہے جس کا دار و مدار تخییل پر ہے، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل سب میں تخییل ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے یہ ایک مانا ہوا طریقہ اور تکنیک ہے صداقت کو دوسرے کے ذہن اور وجدان میں اتارنے کا ۔ سادہ ہو یا رنگین اندازِ بیان میں لوک دھار اسی سے رکھی جاتی ہے لیکن صداقت سے اس کا مضبوط رشتہ قائم رہنا ضروری ہے ۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے یا اعتدال سے تجاوز ہو تو کذب، اور دور از کار مبالغہ کی صورت رونما ہوتی ہے اسلامی ادب میں قصہ کو مجرد تصورات و حقائق اور علمی اور اخلاقی مسلمات اور نظریات کی تمثیل کی غرض سے استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ابو العلاء المعری کے رسالۃ الغفران اور ابن طفیل کے حی بن یقظان کا حال ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض افسانہ و افسوں، اس کی حقیقت ایک مداری کے تماشہ کی ہے ۔ دورِ انحطاط میں طفلانہ مذاق عام ہوتا ہے اسلئے کذب، مبالغہ اور افسانہ و افسوں کا رواج بڑھ جاتا ہے ۔ عربی نقد کے ابتدائی دور میں صدق اور کذب کی جو بحث آتی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے بعض ناقدوں کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے تخییل کو کذب کا نام دے دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے معنی و مطلب کی نسبت سے تخییل کی نوعیت غازہ اور ملمع کاری کی نہیں بلکہ چشم و ابرو کی عشوہ گری اور نگہ کی غارتگری کی ہے تخییل ادب کی جان ہے ۔ خاص طور پر جبکہ عقل و وجدان دونوں سے بیک وقت خطاب کیا جائے ۔ مشرق میں ابو العلاء المعری کی شاعری کبھی پروان نہ چڑھی اس لئے نہیں کہ وہ آزاد خیال تھا بلکہ اس لئے کہ اس کے یہاں تخییل کی کمی ہے ۔ آج مغرب میں اس کو محض اس لئے نوازا جاتا ہے کہ وہ آزاد خیال تھا ۔ اقبال کے یہاں منظم فلسفہ کے ساتھ ساتھ تخییل کی فراوانی ہے اسی لئے ان کی شاعری زندہ جاوید ہے ۔ عربی میں جب اخلاقی شاعری کی ابتدا ہوتی تو بہت سے تجربے ناکامیاب رہے یہاں تک کہ بعض ناقدوں نے یہ فیصلہ دیدیا کہ "دین" شاعری کا موضوع نہیں بن سکتا ۔ یہ اس لئے کہ حقیقت اور تخییل کا امتزاج بایں طور کہ سادہ حقیقت تخییل کی رنگینی میں گم نہ ہو بلکہ تخییل کے رنگوں سے اور چمک اٹھے ۔ ایک بڑی دشوار بات ہے ۔ دشوار ہو تو ہو ادب اور فن کا کمال یہی ہے ۔

نظامِ اخلاق کی جستجو انسان کی فطرت میں ہے ۔ اخلاق کی جستجو بالکل ویسی ہی ہے جیسی قوانینِ قدرت اور سائنس کی جستجو ۔ دونوں ہی انسان کی پُرامن اجتماعی زندگی کے لئے ضروری ہیں ۔ جو قوانین قدرت کے علم سے ممتاز ہوا اسے سائنٹسٹ کہا جاتا ہے ۔ اسی طرح جو انسانی سیرت اور کردار کی باریکیوں پر نظر رکھے اور بہتر زندگی کے طریقے سکھائے اسے ادیب کہیں گے جو قوانین قدرت کا علم رکھے بغیر "فن کاری" کا مظاہرہ کرے اسے شعبدہ باز کہیں گے اسی طرح جو سیرت و اخلاق کا خصوصی علم رکھے بغیر "فن کاری" کا دعویٰ کرے وہ ادیب نہیں بلکہ الفاظ کا شعبدہ باز کہلائے گا ۔

ادیب معاشرہ کا جزو ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے رہبر قافلہ کا جزو ہوتا ہے ۔ ضروری ہے کہ رہبر اور قافلہ دونوں منزل کے تعین کی حد تک متفق ہوں ۔ البتہ رہبر منزل تک پہونچانے والے راستوں کا بہتر علم اور پختہ تر شعور رکھتا ہو ۔ اور اس کی تقریر میں وہ لذت ہو کہ سننے والا یہ جانے کہ جو اس نے کہا گویا وہ اس کے دل میں ہے ۔

استفادہ یا سرقہ؟

فرمان فتحپوری

"انتخاب دواوین" جس میں شعراء کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ امام بخش صہبائی نے دلی کالج کے پرنسپل کے ایما پر ۱۸۴۲ء میں مرتب کیا اور ۱۸۴۴ء میں شائع کر دیا اس کا ایک ناقص الآخر مطبوعہ نسخہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہے اور یہی میرے سامنے ہے اس میں ولی سے لیکر ۱۸۴۲ء تک کے ممتاز ترین اردو شعراء کا انتخاب مختصر سوانح حیات کے ساتھ دیا گیا ہے۔

قدیم تذکروں کے انداز کا یہ انتخاب اُردو ادب کی تاریخ میں یوں اہمیت رکھتا ہے کہ یہ رطب و یابس سے پاک ہے اور اس میں صرف اُن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جو صفِ اول کے شعراء کہے جا سکتے ہیں حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن کلام کے انتخابات خاصے طویل ہیں۔ انتخاب میں انھوں نے جملہ اصناف سخن کو ملحوظ رکھا ہے اور کم از کم دس بارہ صفحات میں ہر شاعر کے اشعار نقل کئے ہیں۔ میرحسن اور منشی مول چند کے سلسلے میں "سحر البیان" اور "خسروانِ عجم" کے طویل اقتباسات بھی دیئے ہیں۔

انتخاب کلام سے قطع نظر "انتخابِ دواوین" کا دیباچہ بھی نہایت اہم ہے۔ اس سے قبل کے تذکروں میں اس انداز کے دیباچے نہیں ملتے۔ صہبائی نے دیباچہ میں شعر کی تعریف، ایجاد، تاریخ، وزن، قافیہ، ردیف اور اصناف سخن سب پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے اور ہر صنفِ سخن کے نمونے بھی مع اوزان نقل کئے ہیں۔ انتخاب کلام میں اشعار اتنی کثیر تعداد میں دیئے گئے ہیں کہ ہر شاعر کے طرز فکر اور مذاق سخن گوئی کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے اور دیوان یا کلیات کے مطالعہ کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

صہبائی کے اس انتخاب سے بعد کے تذکرہ نویسوں اور بیاض نگاروں نے استفادہ کیا ہے۔ گارساں دتاسی نے "تاریخ ادب ہندوستانی" میں اس سے اکثر اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن کریم الدین نے صہبائی کے اس تذکرہ سے کچھ اس طرح استفادہ کیا ہے کہ ان کا تذکرہ "گلدستہ نازنیناں" صہبائی کے "انتخاب دواوین" کا چربہ بنکر رہ گیا ہے دونوں تذکروں کو ساتھ رکھ کر دیکھئے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کریم الدین نے "گلدستہ نازنیناں" کے نام سے صہبائی کے "انتخاب دواوین" کو اپنا بنا لینے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ صریح سرقہ کی حدود میں آتی ہے۔

کریم الدین جنھوں نے فیلن صاحب کی مدد سے ۱۸۴۷ء میں گارساں کی تاریخ ادب ہندوستانی جلد اول کا آزاد ترجمہ بھی "طبقاتِ شعرائے ہند" کے نام سے کیا تھا، نے لکھا ہے کہ ان کا تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" ماہ ذی حجہ ۱۲۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں تمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہوگیا[۱]۔ اسکا مفہوم یہ ہے کہ کریم الدین کا تذکرہ بلحاظ تاریخ تالیف صہبائی کے تذکرہ کے دو سال بعد لکھا گیا اور بہ اعتبار سنِ طباعت ایک سال بعد منظرِ عام پر آیا۔ اس تذکرے میں کریم الدین نے دیباچہ سے لیکر شعراء کے حالات زندگی تک" انتخاب دواوین " سے کلی استفادہ کیا ہے لیکن کہیں ایک جگہ بھی صہبائی کے تذکرہ کا نام نہیں لیا بلکہ اپنے تذکرے کو اپنے انداز کا پہلا تذکرہ بتایا ہے۔

" انتخاب دواوین " اور "گلدستہ نازنیناں" میں کس درجہ مشابہت ہے اور کریم الدین نے صہبائی سے کس نوعیت کا استفادہ کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں دونوں تذکروں کی چند سطریں بطور مثال ایک دوسرے کے مقابل نقل کی جاتی ہیں :-

"انتخابِ دواوین"	"گلدستۂ نازنیناں"
"شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعرائے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہدِ عالمگیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والاجاہ نے اس کی قدردانی کرکے پرورش فرمائی، یہ شخص اول شعرائے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھن میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہ بھی مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے"۔	"شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعرائے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہدِ عالمگیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والاجاہ نے اس کی قدردانی کرکے پرورش فرمائی، یہ شخص اول شعرائے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھن میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہ بھی مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے"۔
صفہ ۲۹	صفہ ۲۸۹
" درد تخلص خواجہ میر صاحب .... فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے۔ مذہب اُن کا حنفی .... علم موسیقی اور فنِ شاعری میں بہت اچھی	" درد تخلص خواجہ میر صاحب .... فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے۔ مذہب ان کا حنفی .... علم موسیقی اور فنِ شاعری میں بہت اچھی

[۱] ملاحظہ ہو "گلدستۂ نازنیناں" مطبع رفاہ عام ۱۲۶۱ھ۔ مملوکہ لیاقت نیشنل لائبریری۔

"انتخاب دواوین"

دست قدرت رکھتے تھے اور .... ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے یہاں منعقد ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں ناصر احمد ہر مہینہ کی ۲۴ تاریخ کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے ہیں۔
.... غرض خواجہ علیہ الرحمۃ نے گیارہ سو ننانوے ہجری میں اس دنیائے دوں سے رحلت فرمائی اشعار ان کے دیوان سے لبطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔"

صفحہ ۴۰

"گلدستۂ نازنیناں"

دست قدرت رکھتے تھے اور .... ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے یہاں منعقد ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں ناصر احمد ہر مہینہ کی ۲۴ تاریخ کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے ہیں۔
.... بغرض خواجہ علیہ الرحمۃ نے گیارہ سو ننانوے ہجری میں اس دنیائے دوں سے رحلت فرمائی اشعار ان کے دیوان سے لبطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔"

صفحہ ۱۵

یہی نوعیت اوروں کے حالات کی ہے لیکن عبارتیں نقل کر کے مضمون کو بے سبب طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لئے شاعر کے نام کے ساتھ تذکروں کے ایسے صفحات کے حوالے درج کئے جاتے ہیں جنکے مضامین لفظاً و معناً ہر طرح یکساں ہیں۔

	انتخاب دواوین	گلدستۂ نازنیناں
سودا	صفحہ ۶۷	صفحہ ۶۵
جرأت	صفحہ ۱۲۵	صفحہ ۱۴۷
شاہ نصیر	صفحہ ۱۶۵	صفحہ ۲۸۱
ممنون	صفحہ ۲۶۷	صفحہ ۱۶۸
ناسخ	صفحہ ۱۹۷	صفحہ ۲۵۲
ذوق	صفحہ ۱۳۲	صفحہ ۱۱۸

دیباچہ کی عبارت بھی صریحاً "انتخاب دواوین" سے ماخوذ ہے البتہ ایک فرق یہ ہے کہ گلدستۂ نازنیناں میں شعراء کی تعداد انتخاب دواوین کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے اور اس میں شعراء کے ساتھ آخر میں چند شاعرات کا ذکر بھی خصوصاً کیا گیا ہے لیکن کیا عجب ہے کہ کریم الدین نے ان کے حالات کے سلسلے میں بھی کسی تذکرے سے اسی انداز کا استفادہ کیا ہو اور ہم ابھی اس سے بے خبر ہوں۔

مومن کی معشوق فریبیاں

عندلیب میرٹھی

تاریخ ادب اس امر کی شاہد ہے کہ ہر عظیم المرتبت شاعر کا اندازِ فکر اپنے پیش رووں اور معاصرین دونوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ نگاہ کا یہی امتیازی اندازِ فکر، اسلوب نگارش اور طرزِ بیان کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے بلکہ شاید اظہارِ خیال کے لئے نئے پیرایوں کی تلاش پر اُسے اُکساتا ہے اور اسی وجہ سے ایک ہی موضوع سے بحث کرنے کے باوجود ہر شاعر کا خیال مختلف اور اندازِ بیان جدا ہوتا ہے۔

غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ تینوں بزرگ اپنے زمانہ کے نہایت جلیل القدر شعراء تھے لیکن ہم عصر ہونے اور قریب قریب یکساں ماحول میں نشو و نما پانے کے باوصف ہر ایک کے خیالات میں بعد المشرقین ہے ادائے مضمون میں بھی ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں، اور اگرچہ ان تینوں حضرات کا موضوعِ شاعری زیادہ تر بیانِ حسن و عشق ہے۔ اندازِ بیان ہر ایک کا اپنا اور خیال جدا ہے۔ پھر زندگی عشق و محبت کے تجربات بھی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس کی افتادِ طبیعت، قوتِ مشاہدہ، ابداعِ تفکر اور ذہنِ رسا کا آئینہ ہوتا ہے۔ بنا بریں جو کیفیات ایک شاعر کے کلام میں نمایاں ہوتی ہیں دوسروں کے یہاں نظر نہیں آتیں۔

مومنؔ کے مطالعۂ کلام سے جہاں خود اُن کے اپنے مزاج و سیرت کا اندازہ ہوتا ہے ان کے محبوب کا تصور بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ عام شعراء کی طرح ان کا محبوب خیالی اور فرضی نہیں ہے، بلکہ بقول جناب نیاز فتحپوری گوشت پوست کا انسان ہے اور جملہ انسانی خصائص اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف شوخ و طرار ہے، بلا کا ذہین و فطین بھی ہے۔ کسی کے فریب میں آنا در کنار، عاشق کی ہر بات کو بہ نظر اشتباہ دیکھتا ہے اور غور کرتا ہے کہ فلاں حرکت کس مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ چنانچہ حسب موقع و محل جواب بھی دیتا ہے۔ لیکن مومنؔ بات بنانے میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ کچھ ایسی تاویلات پیش کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے محبوب کو اُن کی بات کا یقین آ ہی جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاد کو محبوب کے سامنے اس طرح رکھتے ہیں کہ موخر الذکر کو اس میں اپنا ہی فائدہ نظر آتا ہے اور وہ ان کی بات سننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

ہر چند کہ غالبؔ نے بھی ایک مرتبہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ ع

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام!

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مومنؔ اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور اُن کے یہاں اس قسم کے خیالات اتنی کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے کلام کی یہ ایک مستقل خصوصیت بن گئی ہے، لیکن باوجود اعادہ و تواتر یہ مضامین ہر جگہ پُر لطف اور بامزہ ہیں۔ ذیل کی چند مثالوں سے غالباً اربابِ ذوق خود اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ بیان کہاں تک صداقت پر مبنی ہے۔

غیر کے مرنے کے بعد ایک دفعہ محبوب کو اس کی یاد آئی اور کہنے لگا وہ میرا بڑا سچا عاشق تھا مجھے دیکھ کر وفورِ اضطراب

میں اکثر کلیجہ پکڑ لیا کرتا تھا اور دل بیقرار ہو جاتا تھا۔ مومن یہ سن کر کہاں تاب لا سکتے تھے۔ معاً خیال گزرا کہ غیر اگرچہ مر چکا ہے۔ اس کی محبت کا نقش محبوب کے دل میں یوں ہی جاگزیں ہوتا رہا تو اپنا رنگ کبھی نہ جم سکے گا۔ لہٰذا یہ خیال مٹانے کے لئے محبوب سے کہا آپ خواہ مخواہ غیر کی الفت میں گرفتار رہیں۔ اُسے ہرگز آپ سے کوئی عشق نہیں تھا، نہ آپ کی شیفتگی کے باعث وہ کلیجہ پکڑ لیتا تھا۔ وہ تو مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر آتشِ حسد سے بیقرار ہو جاتا تھا اور کلیجہ تھام لیتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عبث تم کو بڑھی الفت وہ کب دیتا تھا دم تم پر　　　یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجہ تھام لیتا تھا!

محبوب ایذا رسانی پر کمربستہ ہے اور صبح و شام عاشق پر نت نئے ستم توڑتا رہتا ہے۔ وصل کا کیا ذکر، وہ عاشق کی صورت سے بیزار ہے، لیکن مومن محبوب سے ملاقات کی نئی شکل نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں میں تمہاری فرقت کے صدمات سہتے سہتے اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ ان کا برداشت کرنا میری عادتِ ثانیہ میں داخل ہو گیا ہے۔ پس ہجر میرے لئے اب ہرگز باعثِ آزار نہیں رہا۔ لہٰذا اگر تم واقعی مجھ پر ستم کرنا چاہتے ہو تو اس کی ایک یہی تدبیر ہے کہ مجھ سے ملاقات کرو، کیونکہ جب کوئی بات خلافِ معمول ہو گی تو مجھے ضرور تکلیف پہنچیگی۔ اس خیال کو حسبِ ذیل الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

بظاہر شعر میں محبوب کا مفاد پیشِ نظر ہے کہ اس کو ظلم کی ایک نئی ترکیب سجھائی ہے لیکن اس میں شاعر کا اپنا جو فائدہ متصور ہے اربابِ نظر سے مخفی نہیں۔

محبوب نے اپنے دروازہ پر پاسبان بٹھا دیا ہے کہ ہر کس و ناکس بلا اجازت گھر میں بار نہ پا سکے۔ مومن کسی طرح اندر داخلہ پانے کے لئے اس کو آمادہ کر لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ واقعی اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اب محبوب پاسبان کی اس حرکت قبیحہ پر بیحد چراغ پا ہے اور آن کی آن میں اس کی گردن اڑا دینا چاہتا ہے۔ مومن پاسبان کے ممنونِ احسان ہونے کے باعث اس کی حمایت میں محبوب سے کہتے ہیں۔ نہیں نہیں خدارا ایسا نہ کیجئے گا۔ یہ غریب اگر قتل ہو گیا تو آپ کے گھر کی حرمت جاتی رہے گی اور جو لوگ آپ کی گلی کو ہمیشہ سے "کوچۂ حرم" کا درجہ دیتے رہے ہیں اس کی عظمت سے منکر ہو جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجیے قتل　　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

محبوب محفل میں اغیار کو ناز و غمزہ دکھاتا ہے لیکن عاشق کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا۔ مومن چاہتے ہیں کہ اس کی نظر التفات بیشتر مجھ پر رہے۔ لہٰذا بظاہر محبوب کے فائدہ کی خاطر مگر درحقیقت اپنی مقصد برآری کے لئے اس سے کہتے ہیں دیکھئے اگر آپ رسوائی سے مصئون و مامون رہنا چاہتے ہیں تو مجھے بھی اپنا غمزہ دکھلاتے رہا کیجئے ورنہ میری طرف نہ دیکھنا ہی آپ کا سارا بھرم کھول دے گا اور اہل محفل سمجھ جائیں گے کہ میں چونکہ اصلی عاشق ہوں اس لئے آپ مجھے دیکھتے ہوئے شرماتے ہیں۔ شاعر نے یہ مضمون کس عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا!

یہی خیال تھوڑے سے فرق کے ساتھ حسب ذیل اشعار میں بیان ہوا ہے ؎

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

رقیب کی محبت محبوب کی نگاہ میں ہمیشہ سے معتبر تھی لیکن یکایک کسی بات سے خیال ہوا کہ اب اگلا سا وفور شوق باقی نہیں رہا۔ مومن گویا موقع کے منتظر تھے۔ سمجھ گئے کہ یہی وقت دشمن کے خلاف محبوب کو بھڑکانے اور اس کی بدگمانی کو یقین کے درجہ تک پہنچا دینے کا ہے۔ کہنے لگے آپ کو تو ناحق یہ وہم ہے کہ رقیب کی محبت میں اب کمی واقع ہو گئی ہے۔ وہ تو آپ سے حقیقی محبت کبھی کرتا ہی نہ تھا اور میں اسی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ کا اس سے بگڑ جانا یقیناً بے جا اور بے معنی ہے! اب یہ خیال لباسِ شعر میں یوں جلوہ فرما ہے ؎

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

عاشق آتش ہجر سے پھنک رہا ہے۔ کوئی صورت ملاقاتِ یار کی نظر نہیں آتی۔ لیکن وہ معشوق کا مزاج شناس ہے۔ جانتا ہے کہ اُسے نازِ یکتائی ہے اور کسی کو اپنا حریف دیکھنا گوارا نہیں۔ بس کہتا ہے آپ نے میرے دل میں جو آگ لگائی تھی اس کے شعلے اب اس قدر بلند ہو گئے ہیں کہ آپ کی برقِ تجلی کا مقابلہ کرنے کے دعویدار ہیں۔ خدارا آئیے اور اپنا جلوہ دکھا کر یہ دعویٰ غلط ثابت کر دیجئے۔ کیسا عمدہ طریقہ محبوب سے ملاقات کا نکالا ہے۔ اب شعر ملاحظہ کیجئے ؎

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

تھوڑے سے فرق سے یہی مضمون ذیل کے شعر میں نظم کیا ہے ؎

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں میں نے دعویٰ کیا تحمل کا

آزار رسانی میں محبوب کو لطف آتا ہے۔ چاہتا ہے عاشق کو کسی نہ کسی طرح ایذا پہنچتی رہے۔ لہٰذا ستمگری کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے۔ عاشق کہتا ہے مجھ پر آپ کا ظلم توڑنا فعلِ عبث ہے۔ کیونکہ میں ایک سخت جان انسان ہوں، ہرگز آپ کے مظالم سے گھبرا جانے یا مر جانے کا امکان نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو آسمان سے میری سخت جانی کا حال دریافت کر لیجئے۔ میں ایک مدت سے اس کے جور و ستم سہہ رہا ہوں لیکن نہ آج تک کبھی گھبرایا نہ جان دی۔ درحقیقت یہ بھی ایک طریقہ محبوب کو ستم رانی سے باز رکھنے کا ہے۔ جو نہایت خوبی سے بیان ہوا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو! تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث

مومن محبوب کے تمام تر التفات کے طالب ہیں۔ نہیں چاہتے کہ وہ دشمن کی طرف ذرا بھی نظر اٹھا کر دیکھے چنانچہ ایسی بات گھڑی جس میں بظاہر رقیب کا فائدہ ہے لیکن حقیقتاً اپنا ہے۔ محبوب سے کہا دیکھئے! آپ کی آنکھ میں جادو بھرا ہوا ہے۔ ہرگز غیر کو نہ دیکھئے ورنہ اس پر جادو ہو جائے گا۔ یہ بات کیسے پیارے انداز میں کہی ہے ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

معشوق کو خیال ہے کہ رقیب سچا عاشق ہے اور اس کے واسطے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے، حتیٰ کہ جان تک دے سکتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ اے محبوب! اگر تو واقعی اسے ایسا سمجھتا ہے تو ذرا اس کو قتل کر کے تو دیکھ، پھر تجھے ہماری اور اس کی محبت کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ یعنی اگر تو نے رقیب کو قتل کر دیا تو ہم محض اس رشک سے کہ وہ تیرے ہاتھوں قتل ہوا خود اپنی جان آپ دے دیں گے۔ اور اس طرح ہماری آزمائش خود بخود ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی معشوق کو فریب دینے کی ایک کوشش ہے، کیونکہ جب رقیب اُن کے راستہ سے ہٹ گیا تو مومن کی مخالفت کون کرے گا اور جب مخالفت جاتی رہی تو ظاہر ہے مومن معشوق پر اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ شعر حسب ذیل ہے ؎

عدو کو قتل کیجیے، پھر ہمارا امتحاں کیجیے گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغِ رشک سے اپنا

عاشق اپنی وفاؤں کا ذکر کر رہا ہے۔ محبوب بگڑ بیٹھتا ہے کہ تمہیں اس قصہ کے چھیڑنے کے سوا اور بھی کچھ کام ہے۔ جائیے میں نہیں سنتا۔ محبوب کا غصہ فرو کرنے کے لئے مومن کہتے ہیں اچھا صاحب! جانے دیجئے، اگر آپ کو ذکرِ وفا سے ایسی ہی چڑ ہے تو قسم لے لیجئے ہم باوفا ہونے کے باوجود آئندہ کبھی آپ کو اپنا وعدۂ قتل تک یاد نہ دلائیں گے۔ مقصد یہ کہ آپ کو قتل کا وعدہ پورا نہ کرنے دینے سے خود کو زندہ و سلامت رکھ سکیں گے۔ شعر ہے ؎

گو قتل کا وعدہ ہو، تقاضا نہ کریں گے گر ذکرِ وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے

رقیب محبوب کی مہربانیوں پر نازاں و شاداں ہے۔ کم بخت میں اتنا ظرف کہاں کہ جو بات راز کی تھی اسے اپنے سینہ میں محفوظ رکھتا۔ اب محل بے محل ہر جگہ یہی ذکر کرتا پھرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر محبوب کو رسوا کر رہا ہے۔ مومن محبوب کے دل سے غیر کا نقشِ محبت مٹانے اور اسے سبک کرنے کے لئے لیکن فی الواقع اپنی شخصیت کو بھاری بھرکم ظاہر کرنے اور اپنے عشق کا اثر جتانے کیلئے کہتے ہیں آپ نے رقیب سے محبت کیا کی اس کے حق میں دشمنی کی، کیونکہ اس چاہ کی بدولت نہ صرف آپ رسوا ہو رہے ہیں وہ خود بھی بدنام ہو گیا ہے۔ لہٰذا لکھتے ہیں ؎

دشمنی کی عدو سے، چاہ نہ کی! تاب کم ظرف کو کہاں؟ تم نے

ظلم کرنا معشوق کی عادت ہے۔ لیکن عاشق اس کی ہر ادا پر فریفتہ ہے، اُسے آزار میں بھی لذت محسوس ہوتی ہے۔ معشوق سے کہتا ہے تم مجھے اس لئے ایذا دیتے ہو کہ تکلیف ہو لیکن جب بجائے تکلیف کے راحت ملے تو ظاہر ہے تمہاری جفاگری بیکار ہے۔ صاف الفاظ میں کہتے نہیں لیکن مومن کا مقصد یہی ہے کہ معشوق ستم سے باز رہے۔ لہٰذا ایسے انداز میں بات سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنے فعل کو خلاف عقل سمجھ کر خود ہی چھوڑ دے ؎

بیوفا پھر حاصل بیداد کیا؟ جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو

محبوب نے مومن کو اپنی محفل سے اٹھا دیا۔ رقیب کو ہنسی کا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے فوراً بات بنائی۔ ہنستے کیا ہو محبوب اس قدر نازک مزاج انسان ہے کہ ہر وہ شخص جو اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرے سمجھ لو انتہائی سبک یعنی ذلیل اور چھچھورا آدمی ہے لہذا تمہارے خوش ہونے کا یہ محل ہرگز نہیں روئے سخن اگرچہ رقیب کی طرف ہے لیکن مومن اسی جواب کے ذریعہ محبوب کو بھی متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے مجھے محفل سے نکال دینے میں غلطی کی۔ دراصل اس سزا کا مستحق تو رقیب تھا کیونکہ وہ سبک آدمی ہے۔ گویا فریب میں مبتلا کر کے محبوب کی نظر میں خود کو محترم و معتبر رکھنا چاہتے ہیں۔ لفظ "سبک" سے اس شعر میں بڑا فائدہ اٹھایا گیا ہے جس سے بیان مضمون میں خاص لطف پیدا ہوا ہے

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر — سبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

ایک بال کی قیمت

ڈومینوک پاسن فرانس کا ایک متمول شہری تھا ایک مکان کی خریداری کے سلسلہ میں وہاں کے رواج کے مطابق اس نے مالک مکان کو اپنا ایک بال بطور بیعانہ دیا جو اس بات کی ضمانت تھا کہ مکان کا سودا ہو چکا ہے۔

بعد کو مالک مکان اپنے وعدے سے پھر گیا اور پاسن کا بیعانہ (بال) واپس کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ پاسن نے مالک مکان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جو ۲۳ برس تک چلتا رہا اور اس کے بعد عدالت کے فیصلہ کی رو سے پاسن کو اپنا بال واپس مل گیا۔

مقدمہ کے اخراجات کا جب جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ بال کی واپسی میں پاسن کے پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے۔

ریاض گورکھپوری

خیر بہوروی

ذرا ٹھہریئے "رند پاک باز ریاض" پر فاتحہ پڑھ لینے دیجئے۔ وہ بھی رندانِ پاک باز کو ثواب پہونچایا کرتے تھے ؎

رندان پاک باز کو پہونچا ئیں گے ثواب
کورے گھڑے میں شیر رہے، انگبیں رہے

ریاض گورکھپوری سے میری مراد وقت کے حافظ وخیام رند پارسا سید ریاض احمد ریاض خیرآبادی سے ہے جن کو گورکھپور کے ذرے ذرے سے والہانہ محبت تھی اور جو گورکھپور کو اپنا وطن ثانی کہا کرتے تھے مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" میں خیرآبادی آپ سراپا خیر، عجیب نسبت ہے۔ میں تو گورکھپوری تھا خیرآبادی کیونکر ہو گیا۔ خیر گورکھپور میں۔ کاش میں بھی گورکھپور میں ہوتا۔
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ "

ریاض۔ خیرآباد۔ ۱۰ رجون ۱۹۳۱ء

ریاض ۱۰ برس کی عمر میں گورکھپور آئے تھے اور چالیس سال سے زیادہ یہاں مقیم رہے اور جوانی کا زیادہ حصہ یہیں کی فضا میں گذارا۔

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور
لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھپور

گورکھپور کی خاک سے ان کی شیفتگی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ یہاں کی موت کو اپنے لئے زندگانی جاوید سمجھتے تھے ؎

یہاں کی موت بھی ہے زندگانی جاوید
ہوائے باغِ جناں ہے ہوائے گورکھپور

اور اہل وفائے گورکھپور کی پرستش تو ان کا دین و ایمان تھا ؎

پرستش ان کی ہمارا تو دین و ایماں ہے
عجیب چیز ہیں اہلِ وفائے گورکھپور

"ادائے گورکھپور" ان کے لئے دنیا سے الگ ایک ادا تھی اور وہ یہاں کی صبح و شام پر "بنارس کی صبح اور "اودھ کی شام" صدقے کرتے تھے ؎

اودھ کی شام بنارس کی صبح صدقے ہو
کہ اک جہاں سے جدا ہے ادائے گورکھپور

علی حزیں نے تو بنارس آنے کے بعد یہاں سے قدم اس لئے نہیں نکالا کہ بنارس معبد عام ہے اور ہر برہمن لڑکا رام و لچھمن کی صفات کا حامل ہے ۔

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

مگر ریاض نے گورکھپور اور جنت کی دل فریبیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رکھا اور گورکھپور آنا جنت کے برابر ثابت کر دیا

چمن بھی، حور بھی، حسن و شباب بھی، مے بھی
جیسے بہشت میں جانا ہو آئے گورکھپور

اللہ رے خوش عقیدگی :-

پکارتی ہیں یہی دل فریبیاں اس کی
نہ آکے ہو جسے جانا وہ آئے گورکھپور

پوری غزل میں گورکھپور سے اپنے تعلق خاص کی جو تصویر ریاض نے کھینچی ہے وہ جذبات کی بے اختیاری اور جوش و گرمی کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز ہے غزل پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گورکھپور میں ریاض پر ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جو نہایت تند و سخت تھا ۔

فضائے گورکھپور، خوش نوائے گورکھپور اور مہمان سرائے گورکھپور کے ساتھ ریاض نے حنائے گورکھپور کی بھی تعریف کی ہے ؎

ہم اپنے خونِ تمنا سے سینچ آئے ہیں حسیں لگائیں، منگا کر حنائے گورکھپور

فرید آباد کی مہندی لاکھ مشہور سہی مگر حنائے گورکھپور سے اس کو کیا نسبت ہو سکتی ہے جس کو ریاض نے اپنے خونِ تمنا سے سینچا ہے ۔

ریاض تم نے لکھی ہے اسی لئے یہ غزل براکہیں نہ تمہیں دل ربائے گورکھپور

دل ربائے گورکھپور ریاض کو جو چاہیں کہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جائے گا کہ ریاض نے گورکھپور اور دل ربائے گورکھپور دونوں کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے ۔

ریاض کے استاد خدائے سخن منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم نے بھی لکھنؤ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے ۔

رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

اور مرزا غالب نے بھی صنم کدۂ بنارس کے مناظر حسن وجمال کی تصویر کھینچی ہے اور یہاں کے "قیامت قامتان، مژگان درازان" پری وشوں کی تعریف کی ہے

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور — بہشت خرم و فردوس معمور
قیامت قامتان مژگاں درازاں — ز مژگاں بر صف دل نیزہ بازاں
بتانش را ہیولی شعلۂ طور — سراپا نور ایزد چشم بد دور

اور کلکتے کے نازنین بتان خود آرا کو بھی بڑے درد و کرب کے ساتھ یاد کیا ہے ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

مگر ریاض نے گورکھپور کا ذکر جس ذوق و شوق کے ساتھ کیا ہے وہ ریاض کے حدیث شوق و شباب کی ایسی تفسیر ہے جس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

گورکھپور سے ریاض کی محبت کا اثر دیکھئے کہ ان کا دیوان بھی یہیں مرتب ہوا اور ایک گورکھپوری ہی نے اس کو اپنے زیر اہتمام حیدر آباد میں طبع بھی کرایا۔ ریاض نے کہا تھا۔

تھا ودیعت وہ بہر گورکھپور
چھپ کے نکلے گا دس مہینے میں

دیوان گورکھپور ہی میں چھپنے والا تھا مگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے یہاں وہ چار جز سے زیادہ نہ چھپ سکا۔

دیوان کا انتساب بھی گورکھپور ہی کی جنت ریاض رضواں کے نام ہے اور یہ نام بھی ریاض ہی کا عطیہ ہے

نام دیوان "ریاض رضواں" ہے
آئے گی کھل کے اب تو پینے میں

دیوان کے حصہ اول کا تاریخی نام "آتش گل تر" اور حصہ دوئم کا "آتش تر" ہے۔

اس کی تاریخ "آتش گل تر"
"آتش تر" پلاتے پینے میں

گورکھپور سے ریاض کی شیفتگی بے وجہ نہیں تھی۔ اسی شہر کی شعر آفریں فضا میں ان کی شاعری کی نشوونما ہوئی تھی اور ان کی انشا پردازی کا جوہر اصلی کھلا تھا "فتنہ" اور "عطر فتنہ" ریاض نے گورکھپور ہی سے نکالا تھا جو نیم مزاحیہ اور شریفانہ طنز و مزاح کا مرقع تھا

فتنے کو پوچھتا تھا کوئی کس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

"عطر فتنہ" میں اس دور کے مشاہیر شعرا کی طرحی کلام کا انتخاب شائع ہوتا تھا اور یہ شعر اس کی

لوح پیشانی کا طغرا تھا:۔

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پہلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

یہ دونوں ننھے منے پرچے ریاض کی خوش مذاقی بذلہ سنجی اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ گورکھپور سے "ریاض الاخبار" اور "صلح کل" ریاض ہی کے قلم کے سائے میں شائع ہوتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ریاض کی شہرت شاعر کی حیثیت سے ہوئی حالانکہ وہ شاعر کم ادیب و نثر نگار زیادہ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ایک مضمون "ریاض بحیثیت ادیب و نثار" لاہور کے مشہور رسالہ "عالمگیر" میں لکھا تھا لیکن وہ سرسری تھا اور یہ عنوان تفصیل چاہتا ہے۔ ریاض اپنے دور کے ممتاز ادیب، صاحب طرز انشاپرداز اور مانے ہوئے صحیفہ نگار تھے جس زمانے میں "اودھ پنچ" لکھنو کے ایڈیٹر سجاد حسین اور طوطی ہند میرٹھ کے ایڈیٹر سید مرتضیٰ حسین بیان یزدانی کی قلمی معرکہ آرائی ہوئی تھی تو ان کی انشاپردازی اور قوت تحریر کا ایسا رعب دلوں پر چھا گیا تھا کہ بہتوں کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ ریاض کی انشاپردازی کی خصوصیت ان کی شرافت تحریر تھی جس کا اعتراف ان کے حریفوں کو بھی ہے کہ ریاض کے قلم کی زبان سے کبھی کوئی فقرہ یا جملہ ایسا نہیں نکلا جو تہذیب سے گرا ہوا ہو۔ اور جس پر شرافت تحریر کو شرم آئے بازاری اور عامیانہ زبان تو گویا ان کو آتی ہی نہیں تھی۔ ریاض کی نثر کے نمونے ان کے ناول "حرم سرا" "نظارہ" اور "تصویر" میں ملتے ہیں اور ان کے خطوط میں بھی ان کے قلم کی گلکاریاں نظر آتی ہیں۔

ایڈیٹر شباب کو لکھتے ہیں:۔

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے
اے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

"شباب" جام شراب بنکر آیا کہ بڑھاپے میں کام دے بھی وہ چیز ہے جو بڑھاپے میں بھی کام آتی ہے جوانی میں بھی۔ ٹائیٹل پیج تو پنجاب کے پرچوں کو بھی شرمانے والا ہے۔

"اللہ کرے حسن شباب اور زیادہ"

"شباب" اپنے ساتھ اک پارہ جگر بھی لایا یعنی لخت دل کا کارڈ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ مرحوم کی یاد نے تڑپایا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بیٹا باپ کو نہیں پہچانتا۔ بھتیجے کی سعادتمندی ہے کہ اس کو میری بزرگی کا خیال ہے۔ اللہ ترقیاں نصیب کرے۔ اس میں نسیم نہونوی اور امین سلونوی برابر کے شریک ہیں۔ انتخاب اور شباب دونوں ساتھ ساتھ لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ انتخاب کے سب نمبر ملے۔ یہ امر تقاضائے سن سے تھا۔ اب عوارض نے اور بھی کام کا نہ دکھا دے پیری و صد عیب۔ مگر جوانی ہزار عیب تھی۔ اس لئے یہ غنیمت ہے

مگر کیا غنیمت ہے یہ کہنے کے دن گئے" یا کہنے کے لائق نہیں رہے

یہ کالی کالی بوتلیں ہیں جو شراب کی
راتیں ہیں اس میں بند ہمارے شباب کی

میں کسی حال میں بھی ہوں کوشش کروں گا کہ کارڈ کی تعمیل کروں۔

دعاگو

ریاض خیرآبادی

ایک خط میں راقم الحروف کو لکھتے ہیں:۔

"مکرمی۔ مشرق کے لئے آپ اس کے مصداق ہیں" مردے از غیب بروں آید وکارے بہ کند" نیز قاضی مقبول حسین صاحب۔ جبتک قاضی صاحب ادارت اپنے ہاتھ میں نہ لیں آپ ایک ہفتے کیلئے بھی مشرق سے جدا نہ ہوں آپ میں بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کی تحریر برہم مرحوم سے بہت ملتی جلتی ہے یہ بات اچھے اچھوں کو نصیب نہیں۔

نمائشی مشاعرے کا انتخاب اچھا ہے ایک شعر غلطی کی وجہ سے بہت برا چھپا۔ فوراً دوسرے پرچے میں تصحیح شائع کر دیجئے کہ سہو کاتب سے منتخب شعر کے سوا گہر کا ایک شعر غلط چھپ گیا ہے جسکی تصحیح گہر صاحب یوں کرتے ہیں

کٹتے ہیں رات دن مرے یادِ شباب میں
میں توبہ کرکے اور گنہگار ہو گیا

توبہ کیا' چھپا ہے توبہ کی چاہیے اسی طرح مصرع اول میں "غرق" کا لفظ یاد میں غرق" خلاف زبان ہے۔

والسلام

ریاض۔ خیرآباد۔ اودھ

۱۵ مارچ ۱۹۲۹ء۔

یہ پہلا خط ہے جو ریاض نے مجھے تحریر فرمایا تھا جب میں نے ہفتہ وار اخبار مشرق گورکھپور کے ایڈیٹر حکیم برہم کے انتقال کے بعد اس کا اداریہ لکھا تھا۔ ریاض کی انشائے عالیہ کا ایک سلسلہ" ریاض آپ اپنے آئینے میں یادش بخیر مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار لکھنؤ میں شروع کیا تھا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور ہمارا ادبی سرمایہ بوڑھے ریاض کی جوان تحریروں سے محروم رہ گیا۔

ریاض کے ادب وانشا کے قدر شناسوں میں میر ناصر علی اور مہدی افادی جیسے انشا پرداز شامل تھے اور ریاض

کے خواجہ تاش بھائی پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر تو ریاض کی شاعری سے زیادہ ریاض کی شگفتہ نثر نگاری، شوخی تحریر اور شریفانہ طنز و مزاح کے قائل تھے۔

ریاض نے ۱۹۰۵ء میں گورکھپور کو خیر آباد کہا تھا اور راجہ محمد علی خاں ساحر والیٔ ریاست محمود آباد کے اصرار پر لکھنؤ گئے تھے اور کہا تھا

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

لیکن لکھنؤ کے دوران قیام میں بھی گورکھپور کے احباب کی یاد سے غافل نہیں ہوئے۔

ریاض احبابِ گورکھپور اکثر یاد کرتے ہیں
زباں پر میری اکثر ذکر گورکھپور رہتا ہے

جس ریاض نے کبھی یہ کہا تھا:-

ریاض اس شہر سے اب کیا کریں ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہے خاکِ گورکھپور ہو جانا

وہ گورکھپور کو کیسے بھول سکتا تھا گورکھپور آنے جانے کا سلسلہ ریاض نے آخر وقت تک باقی رکھا۔ اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد کے ساتھ داغ کہنہ تازہ کرنے کے لئے اکثر گورکھپور آتے جاتے رہے:-

ریاض اب اس طرح آجاتا ہے دو دن کو شباب
داغِ کہنہ تازہ کر لاتے ہیں گورکھپور سے

لکھنؤ کا سفر ریاض کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا تھا اسی نامبارک سفر میں ان کا ایک بکس چوری گیا تھا جس میں ضروری کاغذات اور ریاض الاخبار کی فائلوں کے ساتھ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی تھا جس کا غم ان کو تا حیات تڑپاتا رہا گورکھپور کے میرے زمانۂ قیام میں اس دیوان کی کئی غزلیں مرحوم کی زبان سے سننے کا موقع ملا تھا۔ ذیل کی غزل بھی ان کی زبان سے سنی تھی جو انھیں کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی میرے قلمی ذخیرے میں محفوظ ہے اور ان کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے۔

کیوں کہا شربتِ دیدار میں کیا رکھا ہے — ہو نہ ہو آپ نے کچھ زہر ملا رکھا ہے
سچ ہے اجڑے ہوئے دل میں مرے کیا رکھا ہے — ہاں حسینوں نے پری خانہ بنا رکھا ہے
تیغ قاتل نے بھرے ہاتھ لہو میں ناحق — خونِ بسمل میں کہیں رنگ حنا رکھا ہے
ہیں جدھر جاؤں ادھر ساتھ ہی جھرمٹ انکے — ان حسینوں نے تماشا سا بنا رکھا ہے
دیکھئے جب وہی ہر پھر کے نظارہ اپنا — آرسی نے انھیں انگلی پہ نچا رکھا ہے
چھوٹے چھوٹے ترے ہاتھوں سے یقیں کیونکر آئے — جورِ پنہاں کوئی گردوں پہ اٹھا رکھا ہے
ہم دکھا دیں گے ہزاروں میں تماشا اپنا — حشر تو آئے کہیں وعدہ وفا رکھا ہے
داغ دل آج دکھانے کو ہوئے ہیں بے چین — میں نے انگاروں پہ ان کو بھی اٹھا رکھا ہے

وقت کی بات ہے کیا وصل میں افتاد پڑے — ساتھ شوخی کے حیا کو بھی لگا رکھا ہے
ہم بھی کیا شخص ہیں اللہ سلامت رکھے — کہ جفا پیشہ حسینوں کو ستا رکھا ہے
ہم بھیجے کو نہ گئے در پہ بڑی خیر ہوئی — تم نے اچھا سگِ درباں کو لگا رکھا ہے
دے نہ دے بہرا اِن کام ہماری آواز — وقت بے وقت کو ناقوس لگا رکھا ہے
اس طرح سے کبھی ہم نہ شرر اٹھتے تھے — شام سے شمع کو کچھ تم نے سنا رکھا ہے

چوم لیتے ہیں مرا منہ جو پری چہرہ ریاض
کون ایسا مری باتوں میں مزا رکھا ہے

ایک بار ریاض نے اپنے ایک اور دیوان کا بھی ذکر فرمایا تھا جو انھوں نے مرزا غالب کے دیوان کے جواب میں مرتب کیا تھا۔ ریاض کی زبان سے سُنے ہوئے بہت سے اشعار بھی مطبوعہ دیوان میں نہیں ہیں اور بہت سے شعروں کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔

ایک غزل جو دیوان کے صفحہ ۹۳ پر اس نوٹ کے ساتھ درج ہے کہ "یہ نامکمل غزل خیرآباد کے ایک قوال سے دستیاب ہوئی" اس کا مطلع ریاض نے اس ترتیب کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا۔

میکدے میں شور اٹھا مینا اٹھا۔ ساغر اٹھے — اتنی ساقی نے پلائی رند توبہ کر اٹھے

لیکن دیوان میں اس کی ترتیب اس طرح ہے:-

شور تھا بوتل اٹھے مینا اٹھے ساغر اٹھے
اتنی ساقی نے پلا دی رند توبہ کر اٹھے

ہم بھی اٹھتے ہیں پئے طوفِ حرم زاہد ٹھہر — دور آخر ہے یہ ساغر کا ابھی پی کر اٹھے

یہ شعر بھی ریاض نے اسی طرح پڑھا تھا مگر دیوان میں پہلے مصرعہ کی ترکیب اس طرح ہے۔

"اُٹھتے ہیں طوفِ حرم کو ہم بھی اے زاہد ٹھہر"

پھول برسے جس طرف واعظ ہوا تیرا گزر — ہم سے دیوانے جدھر گزرے ادھر پتھر اٹھے

یہ شعر غزل میں موجود نہیں ہے۔ شعر پڑھنے کے بعد ریاض نے فرمایا تھا کہ "پھول" شراب کی ایک قسم ہے

اب تو ریاض پھول اڑاتے ہیں رات دن — جوبن یہ لوٹتے ہیں عروسِ بہار کا

پھول کے مول خزاں میں ارے ساقی تلچھٹ
ان دنوں ہے مئے سرجوش سے اونچی تلچھٹ

ریاض کی بہت سی غزلیں اس وقت کے اخبارات و رسائل میں بھی ملتی ہیں جو دیوان میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔ میں نے گورکھپور کی ادبی خدمات میں ایک مضمون میں ریاض کی گل افشانیٔ گفتار اور ان کی صحبتوں کے ذکر جمیل کے ساتھ اس وقت کے مشاہیر اہل قلم احسان اللہ عباسی۔ حکیم برہم۔ عبداللہ حسرتی۔ مہدی افادی اثہری مولوی سبحان اللہ عظیم۔ قاضی تلمذ حسین اور کئی ایسے شعراء کا بھی ذکر کیا ہے جو ریاض کے ہم عصر تھے اور ان میں سے بعض ریاض سے شاعرانہ چشمک بھی رکھتے تھے۔ ایک صاحب جن کا نام محمد حسین تھا اور تخلص عجیب، جمسے کہتے تھے اور دہلی میں اپنے کھیڑے

کے ساتھ سوانگ اٹھایا کرتے تھے ذات کے معمار تھے ان کے لئے ریاض نے ایک طرحی مشاعرے میں غزل کہی تھی:

آج معماروں کا سردار خفا ہے مجھ سے
ٹوٹی مسجد کی طرح ہو نہ مرمت میری

ریاض کی شاعری کا موضوع اصلی خمریات، اور رندانہ شوخی ہے جو ان کے ساتھ ختم ہوگئی۔ شراب اور متعلقات شراب پر انھوں نے ہزاروں سے زیادہ اشعار لکھے ہیں اور ہر شعر اپنی ایک جداگانہ نوعیت رکھتا ہے

جس دن سے حرام ہوگئی ہے — مئے خلد مقام ہوگئی ہے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی — جب ٹوٹی ہے جام ہوگئی ہے
قسمت میں ہماری اب پینا ہے نہ کھانا ہے — انگور کا پانی ہے انگور کا دانا ہے
اچھی پی لی، خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی
اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا — طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زم زم نکلتا ہے

رات کعبہ میں گئی قلقلِ مینا بن کر — نہ تو چھپتی ہے نہ دبتی ہے خرابات کی بات

حیرت ہوتی ہے کہ شراب کے اتنے پہلوؤں پر اظہار خیال کرنے والے ریاض نے شراب کی ایک بوند بھی اپنے دامن تک نہیں آنے دی۔ اور یہی ریاض کی پاکیزہ سیرت کی وہ خصوصیت ہے جو ان کو عام انسانوں سے الگ کرتی رہیگی جس لطف اور مزے کے ساتھ ریاض نے شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر کیا ہے اسی لطف اور مزے کے ساتھ انھوں نے واعظ، ناصح، شیخ، زاہد اور پیرِ مغاں سے بھی چھیڑ چھاڑ کی باتیں کی ہیں۔

رندانہ شوخی اور بذلہ سنجی کی حد یہ ہے کہ ریاض نے اپنے آپ کو اور اپنی ڈاڑھی کو بھی معاف نہیں کیا ہے۔

گھٹا ہے ریاض اپنی ڈاڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

کہتی ہے اے ریاض درازی یہ ریش کی — ٹٹی کی آڑ سے ہے مزا کچھ شکار کا

پیری میں ریاض اب تو جوانی کے مزے ہیں
یہ ریش سفید اور مئے ہوش ربا سرخ

ریاض کی زندگی میں میں نے ایک مضمون "ریاض کی ڈاڑھی" کے عنوان سے لکھا تھا اس وقت تک میں نے ریاض کو دیکھا نہیں تھا جب وہ گورکھپور کے عام دوست رئیس مولوی سبحان اللہ مرحوم کے یہاں سید جالب دہلوی کے ساتھ تشریف لائے تو وصل بلگرامی مرحوم نے جو ان دنوں مولوی صاحب کی ریاست کے منیجر کی حیثیت سے مستقلاً گورکھپور آگئے تھے ریاض سے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ انھوں نے آپ کی ڈاڑھی پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس کو جالب صاحب شائع کریں۔

سید جالب صاحب اس وقت روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے اور میں گورکھپور سے اس کا نامہ نگار تھا۔ وصل بلگرامی

کے مزاج سے جو لوگ واقف ہیں انھیں اس پر تعجب نہ ہوگا انھوں نے ریاض صاحب سے طے کیا کہ آپ مٹھائی کھلائیں تو آپ کی ڈاڑھی رسوا ہونے سے بچائی جا سکتی ہے۔ ہائے کیسے معصوم لوگ تھے۔ حضرت ریاضؔ نے شرط منظور کرلی اور پانچ روپے وصل مرحوم کی جیب میں آگئے اور مضمون چھپ نہ سکا۔ اسی دن شہنشاہِ خمریات لسان العصر ریاضؔ نے مجھے حکم دیا کہ "مٹھائی لاؤ اور شاگرد ہو جاؤ"

دوسرے دن سہ پہر کو مٹھائی لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور شاگردی میں داخل کیا گیا۔ سامنے خلافت اخبار پڑا ہوا تھا جس میں ان کی غزل شائع ہوئی تھی۔ ارشاد ہوا کہ اسی طرح میں قافیے کے التزام کے ساتھ غزل کہو۔ بہ مشکل غزل کہی اور خدمت میں پیش کی جو کئی مہینے کے بعد خیر آباد سے اس خط کے ساتھ واپس آئی۔

" عزیزمن دعا۔ میں نے آپ کی غزل جیب میں رکھ لی تھی۔ ماہِ مبارک میں بھولا رہا۔ اب وہ غزل اتفاق سے مل گئی اصلاح کیا ہے۔ آپ نے ضد فرمائی اس لئے تعمیل کی گئی۔ میں ہرگز اس قابل نہیں ہوں کہ کسی کے کلام پر اصلاح دے سکوں اپنے کلام کو خود اصلاح کے قابل سمجھتا ہوں۔

" من آنم کہ من دانم "

ریاض۔ خیر آباد

۷ مارچ ۱۹۳۰ء

ریاضؔ اصلاح دینے سے بہت گھبراتے تھے فرماتے تھے کہ " اصلاح دینے سے اچھا یہ سمجھتا ہوں کہ غزل لکھ کر دے دوں " اور ان کے شاگرد ایسے ہی تھے جن کو وہ غزلیں لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ اصلاح دینے کا کام انھوں نے آقائے سخن حضرت وسیم مرحوم کو سپرد کر دیا تھا۔ "تحفۂ خوشتر" انھیں کی سرپرستی اور نگرانی میں گورکھپور سے شائع ہوتا تھا۔

ریاضؔ کا طریقِ اصلاح معلوم کرنے کے لئے ان کی اصلاح کی ہوئی ایک غزل لکھتا ہوں غزل میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ریاض کی غزل کا رنگ باقی رہے۔

ریاضؔ	نہ منہ دیکھو چشمِ سوزن کسی کا	رفو کرنے بیٹھے ہیں دامن کسی کا
راقم	اسے اڑ کے لینا ہے دامن کسی کا	کرے خاک ادب، خاک مدفن کسی کا
ریاضؔ	مزا ہو کہ جھجک جھجک کے رہ جائے بجلی	گلوں سے چھپا ہو نشیمن کسی کا
راقم	نہیں بے سبب برق کی بے قراری	مگر ڈھونڈتی ہے نشیمن کسی کا
اصلاح	بڑھی ہے بہت برق کی بے قراری	ہے مدنظر کیا نشیمن کسی کا
ریاض	یہ شوخی کہ اڑتی ہے ٹھوکر سے انکی	ادب بھی کچھ اوخاک مدفن کسی کا
راقم	دریچوں کو بھی بند رکھتا ہے ظالم	وہ کوچہ ہو اجب سے مدفن کسی کا
اصلاح	قیامت اٹھاتے ہیں وہ آتے جاتے	بنا پیشِ در جب سے مدفن کسی کا

ریاض زمانے میں ڈرنے کی چیز اک ہمیں ہیں ہمیں لوٹ لیتے ہیں جوبن کسی کا
راقم برستا ہے کیا جوبن اس سادگی پر ذرا دیکھئے تو یہ جوبن کسی کا
اصلاح رہے گا نہ یہ دیرے آنچل سے دب کر بُری طرح اُبھرا ہے جوبن کسی کا
راقم ہوا بار ور اب وہ نخل جوانی ذرا بڑھ کے دیکھو تو جوبن کسی کا
اصلاح .... وہ بوٹے سے قد پر وہ جوبن کسی کا
راقم خدا کی قسم دیکھنے کی ہیں چیزیں یہ جوشِ شباب اور یہ جوبن کسی کا
اصلاح .... یہ جوش جوانی وہ جوبن کسی کا
اٹھا کرتے ہیں فتنے دن رات جس سے اسی راستے میں ہے مدفن کسی کا

اس شعر کا پہلا مصرعہ ریاض کا عطیہ ہے میں نے صرف دوسرا مصرعہ کہا تھا۔

راقم شباب آکے کیا حشر برپا کرے گا کہ ہے آفتِ جاں لڑکپن کسی کا
اصلاح شباب آکے برپا کرے گا قیامت ....
راقم انھیں چین سے شب کو سونے نہ دیگا یہ نالہ کسی کا یہ شیون کسی کا

اس شعر کا مصرعۂ اول استاد کا عطیہ ہے۔

راقم اٹھاتا ہے خیران تڑپتے دلوں کو نہ کیوں خاک پر لوٹے دامن کسی کا
اصلاح اٹھائیگا محشر میں شر خیر کیا کیا جو ہاتھ آگیا اس کے دامن کسی کا

بات ریاض کے قیام گورکھپور سے شروع ہوئی تھی جہاں کی گلیوں میں انھوں نے اپنی جوانی کھوئی۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

اور بڑھتے بڑھتے کہاں سے کہاں پہونچ گئی اس میں قصور میرے قلم کا نہیں ریاض کی خوش اوصافی کا ہے جن کے بارے میں مولانا نیاز نے لکھا ہے۔

"ریاض کیا چیز تھے اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اس کیلئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں لیکن اختصار و اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اسکے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسفؑ کے خصوصیات معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

اِنَّ ھٰذا اِلّا مَلَکٌ کریم

اور اس کے بعد بھی عرفی کا یہ مصرعہ پڑھوں گا۔

"مرغِ اوصاف نواز اوجِ بیاں انداختہ"

مولانا آزاد اپنے خطوط کے آئینہ میں

(ایک ریڈیائی تقریر)

نیاز فتحپوری

انسان کا مطالعہ اور اشیاء کا مطالعہ، ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ہم ایک پھول کی تصویر دیکھ کر صرف اس کی ظاہری ساخت اس کی پتیوں کی ترتیب کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور اگر وہ تصویر رنگین ہے تو اس کے رنگ کا بھی۔ لیکن ایک انسان کی تصویر میں صرف اس کے اعضاء اس کے خدوخال ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتے بلکہ بحیثیت مجموعی کچھ اور چیز بھی سامنے ہوتی ہے، جو ہماری نگاہوں کو مجبور کرتی ہے کہ کاغذ کی سطح کے اندر نفوذ کر کے صاحب تصویر کی ذہنیت تک پہونچنے کی بھی کوشش کرے۔ بالکل یہی حال انسانی تحریروں کا بھی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ تصویر میں ایک شخص کا صرف مادی وجود ہمارے سامنے ہوتا ہے اور تحریروں میں اس کا ذہن، یعنی وہ زیادہ تر دعوت نگاہ ہے اور یہ دعوتِ فکر و نظر۔

پھر جس طرح ہم تصویر کے مختلف poses سے چہرہ کی ساخت کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم ایک شخص کی مختلف تحریروں سے اس کے مختلف ذہنی میلانات کو جان سکتے ہیں، لیکن اگر سوال ذاتی مطالعہ کا ہو تو اس صورت میں ہم کو اس کے نجی خطوط ہی سے مدد مل سکتی ہے جن میں وہ سب سے زیادہ برافگند و نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر غالب کے خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم نہ کبھی اس کی شخصیت کو جان سکتے اور نہ یہ سمجھ سکتے کہ اس کی شاعری پر اس کے طبعی میلانات کے نقوش کتنے اور کیسے ہیں — اسی طرح اگر مولانا آزاد کے خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو شاید ہم کبھی نہ جان سکتے کہ محراب و منبر کے آزاد اور خلوتِ آرمیدگی کے آزاد میں کتنا فرق ہے۔

مولانا آزاد کے جتنے خطوط اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں انہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق محض ادبی مسائل سے ہے، دوسرے وہ جو علمی و مذہبی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے وہ جن کو محتاط قسم کی خود کلامی یا Soliloquy کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ — غلام رسول مہر کو جو خطوط انہوں نے لکھے ان کا تعلق زیادہ تر غالب و غالبیات سے ہے۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا شبلی سے ان کی مراسلت زیادہ تر تاریخی و علمی یا تصنیفی و تالیفی حیثیت رکھتی ہے جن کو شذرات علم و ادب کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ لیکن وہ خطوط جو غبارِ خاطر کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں، ایک حد تک ضرور ایسے ہیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب سے شب خوابی کے لباس میں باتیں کر رہے ہیں یا پھر علی الصباح اس وقت جب

جنبد کلیدِ میکدہ در دستِ برہمن

تاہم چونکہ مولانا کو یقین تھا کہ یہ خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکتے اس لئے میرے نزدیک ان کی حیثیت "خود کلامی" کی سی رہ جاتی ہے، یا Essays کی سی۔

ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں بعض ان باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے جنہیں شاید ہم کبھی نہ جان سکتے اگر مولانا خود نہ ظاہر کر دیتے، مثلاً خاندانی ماحول، ابتدائی تعلیم و تربیت، فطری میلانات، ذہنی کشمکش، آزادیِ فکر و احساس، ذاتی مشاغل وغیرہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ غیر معمولی طور پر Precocious پیدا ہوئے تھے اور فہم و عقل کی دنیا میں وہ گھٹنوں چل کر نہیں پہونچے۔

ان کے بعض خطوط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی و ادبی زندگی کے انوکھے پن کا راز کیا تھا۔ اس کو وہ اپنی زبان میں اہلِ قلم کی انانیت Egotism کہتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایک فطری جوش، ایک طبعی اُبال جسے دبایا نہیں جا سکتا اور یہی وہ ناقابلِ ضبط ولولہ تھا جس نے ان کی علمی و عملی زندگی میں ہر جگہ ان کو ایک خاص مقام عطا کیا، کیونکہ ایسے افراد جیسا کہ انہوں نے خود ظاہر کیا ہے، عام ترازو میں نہیں تولے جا سکتے اور ان کے فکر و نظر کی دنیا سب سے علیحدہ ہوتی ہے۔

مولانا آزاد کا زمین پر رہ کر تاروں کو چھو لینا اور انسانوں میں رہتے ہوئے، ایک ملکوتی حصار اپنے چاروں طرف قائم کر لینا اسی فکری انانیت کا نتیجہ تھا جس کا ثبوت ان کی تحریروں اور ان کے خطوط سے ہر جگہ مل سکتا ہے۔

غبارِ خاطر کا ایک خط ہے جس میں انہوں نے اپنے موروثی ماحول، اپنی ابتدائی تعلیم اور اپنے میلانات کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی اسی فطری انانیت کی وجہ سے اپنے موروثی عقاید پر قانع نہ رہ سکے، پرانی راہوں کو چھوڑ کر نئی راہیں انہوں نے پیدا کیں، حقیقت کی جستجو میں نہ معلوم کن کن خارزاروں سے گزرے، تقلید و روایت کی دنیا سے نکلنے کے لئے کس جد و جہد سے کام لیا یہاں تک کہ وہ تمام ان برزخی منازل سے گزر کر آخر کار تسکینِ ضمیر اور نفسِ مطمئنہ کی اس منزل تک پہونچ ہی گئے جس کے لئے ان کی روح اوائل عمر ہی سے بیتاب و مضطرب تھی۔

پھر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں جب کہ وہ جستجوئے حقیقت کی پیچیدہ راہوں سے گزر رہے تھے ملک کے سیاسی حالات نے بھی ان کا دامن اپنی طرف کھینچا اور وہ آخر کار کامل غور و فکر کے بعد اپنے ذہن و عمل کے متوازی خطوط میں لچک پیدا کر کے دونوں کو ایک نقطہ پر مل جانے دیا اور پھر وہیں عزمِ راسخ کا ایک آہنی مجسمہ بن کر ٹھہر گئے۔

ان خطوط سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے غیور انسان تھے اور دنیا کے ہر معاملہ کو وہ کس فلسفیانہ نگاہ اور حکیمانہ استغنا سے دیکھتے تھے۔ جن خطوط میں انہوں نے اپنی داستانِ گرفتاری اور حالاتِ قید و بند لکھے ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فلسفیانہ صبر و ضبط کا کیا عالم تھا۔ ان کو کلکتہ سے کتابیں منگانے کی اجازت دی جاتی ہے جس کی ان کو انتہائی آرزو تھی لیکن وہ اسے گوارا نہیں کرتے، مولانا کی رفیقۂ حیات بسترِ علالت پر ان کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہیں اور مولانا کو اس کی اجازت بھی مل سکتی ہے کہ وہ جا کر ان کو دیکھ آئیں لیکن حکومت سے وہ اس کی درخواست کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو جاتا ہے اور مولانا نہایت صبر و شکر کے ساتھ یہ خبر سنتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں کیسی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، لیکن مولانا کی زندگی میں اور بہت سی باتیں ہمیں ایسی ہی نظر آتی ہیں جن کو سمجھے بغیر ہی سمجھنا پڑتا ہے۔

مولانا کے خطوط دوسرے اکابر کے خطوط سے بالکل مختلف ہیں۔ ذاتی خطوط کو صرف اس لئے دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کہ ہم کو ان سے لکھنے والوں کی بے تکلف زندگی کے حالات بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتے ہیں، لیکن مولانا کے جو خطوط اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں، وہ زیادہ تر پند نامہ عطار کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ان کی خلوت پر روشنی نہیں پڑتی، یہاں تک کہ حکایت زاغ و بلبل اور چڑے چڑیا کی کہانی قسم کی ہلکی چیزوں میں بھی وہ اپنی فلسفیانہ سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور جب اپنے ذوقِ چائے نوشی کا ذکر کرتے ہیں تو گفتگو اس کے آئین و آداب تک پہونچ جاتی ہے، اسی طرح جب سلسلۂ بیان میں کسی خاص

شخص یا مقام یاد آجاتا ہے تو وہ تاریخ کے صفحے الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ الغرض مولانا کے ان خطوط سے ان کی خلوت پہ کوئی روشنی نہیں پڑتی اور جنہوں نے مولانا کا مطالعہ زیادہ قریب سے کیا ہے ان کو بھی خلوتیانِ راز بننے کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ مولانا کی فطرت اس صدف کی سی فطرت تھی جو اندر ہی اندر قطرۂ نیساں کو موتی بنایا کرتی ہے اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ ان خطوط سے ان کے جن ذاتی معمولات پر روشنی پڑتی ہے وہ صرف ان کی صبح خیزی ہے یا چائے سگریٹ سے غیر معمولی دلچسپی اور اس سے آگے ہمیں ان کی دنیائے خلوت کا حال بالکل معلوم نہیں ہوتا۔

افسوس ہے کہ ان کا کوئی خط ایسا ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان پر کبھی عہد طفلی و شباب بھی آیا تھا یا نہیں اور اگر آیا تھا تو اسے کس طرح انہوں نے بسر کیا۔

(پھر اگر انھوں نے اس قسم کے خطوط لکھے تھے اور ضایع ہو گئے تو یقیناً بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اگر قصداً شایع نہیں کئے گئے تو پھر یہ بات ظلم کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔)

کاش کہ ان کی زندگی کا کوئی ایک ہی واقعہ ہم کو ایسا مل جاتا کہ باوجود پختگی عقل و ہوش و آگاہی دین و تقویٰ کسی وقت بے اختیارانہ ان کی زبان سے یہ بھی نکل گیا تھا کہ

الفراق اے ہوش و تقویٰ ۔ الوداع اے عقل و دیں!

نگار پاکستان کا نیاز نمبر سالنامہ سنہ ۶۳ء

جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب نے حصہ لیا ہے اس میں حضرت نیاز فتچپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو، مثلاً ان کی افسانہ نگاری۔ تنقید، اسلوب نگارش۔ انشا پردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافی زندگی، شاعری و ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایک ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفحات ۴۲۴ ۔ قیمت۔ آٹھ روپے

(منیجر نگار پاکستان)

منیر شکوہ آبادی

پر

ایک نظر

ضیاء احمد بدایونی

منیر اور کلامِ منیر سے میری دلچسپی کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا۔ جب ہوش سنبھالا تو نہ صرف محلے (فرشوری ٹولہ) اور شہر (بدایوں) میں بلکہ اپنے گھر میں شعر و ادب کے چرچے سنے۔ والد مرحوم[1] تو منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد تھے لیکن میرے تایا صاحب (بڑے چچا) نے اول منیر کا تلمذ اختیار کیا اور منیر کے انتقال کے بعد امیر مینائی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ ان کے تلمذ کا قصہ جو مجھ تک روایتہً پہونچا بہت دلچسپ ہے یہ واقعہ جس کو تقریباً نوے برس گزرے ہوں گے میری پیدائش سے پہلے کا ہے۔ اس وقت بدایوں میں کچہری نہ تھی اور لوگوں کو مقدمات کے سلسلے میں شاہجہان پور جانا پڑتا تھا۔ تایا صاحب بھی (جن کا تخلص محو[2] تھا) کسی ضرورت سے شاہجہان پور گئے اور اپنے ایک عزیز کے یہاں جو وہاں کے سربرآوردہ وکیل تھے قیام کیا۔ معلوم ہوا کہ آج شام کو کسی شعر دوست رئیس کے یہاں شاندار بزم مشاعرہ ہے جس میں داغ، امیر، منیر، جلال، تسلیم بھی شرکت کرنے والے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ طبیعت بے چین ہو گئی آخر ذوقِ شعر نے اکسایا اور کشش دل نے وقت پر جلسہ گاہ میں پہونچا دیا۔ بڑا اجتماع تھا۔ شعراء باری باری سے غزل سناتے اور مناسب داد پاتے تھے۔ بات ہے، رات ہے قافیہ و ردیف تھا۔ رات زیادہ آچکی تھی۔ کئی اساتذہ غزل پڑھ کر دادِ سخن پا چکے تھے کہ تین بجے کے قریب منیر کے سامنے شمع آئی اور انہوں نے مطلع پڑھا

ان رو زوں لطفِ حسن ہے آؤ تو بات ہے   دو دن کی چاندنی ہے پھر اندھیاری رات ہے

تو تمام مشاعرہ تعریفوں سے گونج گیا۔ ہر ہر شعر پر دل کھول کر داد دی گئی اور صبح ہوتے مشاعرہ ختم ہوا دوسرے روز حضرت محو نے جناب منیر کی خدمت میں حاضر ہو کر تلمذ کی استدعا کی جس کو منظور کیا گیا۔

غرض اس قسم کے چرچے لڑکپن ہی سے کان میں پڑتے رہے۔ اور جن شعراء سے رفتہ رفتہ وابستگی ہو گئی ان میں ایک منیر بھی تھے۔ شعر کے حسن و قبح کا تو اس وقت کیا شعور ہوتا البتہ طبیعت کو لگاؤ ضرور پیدا ہو گیا۔ مطالعہ اور تجربہ بڑھا تو کچھ نہ کچھ تنقیدی شعور بھی آیا اور منیر میں محاسن کے علاوہ کچھ نقائص بھی نظر آئے۔ آج کی صحبت میں اسی مسئلے پر مختصراً

---

[1] مولوی رفیع احمد عالی وکیل بدایوں صاحب دیوان و دیگر تصانیف

[2] مولوی شفیع احمد محو وکیل۔ دو یا تین دیوان مرتب کئے جو تلف ہو گئے۔

اظہار خیال کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے بہتر ہوگا کہ ان کے اجمالی سوانح پیش کر دئے جائیں۔

سید اسمٰعیل حسین نام۔ منیر تخلص۔ شکوہ آباد ضلع مین پوری وطن۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سید احمد حسین سے فارسی و عربی اور بڑے بھائی سید اولاد حسین سے علوم دین کی تکمیل کی۔ اسی زمانے میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا اور کچھ دنوں کے بعد لکھنؤ پہونچ کر شیخ ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔ ناسخ کے بعد رشک شاگرد ناسخ سے اصلاح لیتے رہے۔ مرثیے میں مرزا دبیر سے تلمذ تھا۔ ان کو اپنے اساتذہ پر فخر تھا جیسا کہ اکثر اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ درباری شاعر کی حیثیت سے ان کا مختلف رئیسوں سے تعلق رہا۔ مثلاً رؤسائے لکھنؤ، فرخ آباد، باندہ و رام پور۔ وہ نواب یوسف علی خاں ناظم کی دعوت پر رام پور گئے۔ مگر پہونچنے سے پہلے نواب صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کے علم دوست اور فیاض جانشین نواب کلب علی خاں نے ان کو از راہِ قدر دانی شعرائے دربار میں شامل کر کے سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائی۔ بالآخر ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۱ء میں منیر نے سفر آخرت کیا۔ انتقال منیر عالی قدر (۱۲۹۷ھ) سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

ان کی زندگی کا ایک واقعہ کالے پانی میں قید ہونا ہے۔ ان پر ایک طوائف نواب جان کے قتل کے جھوٹے الزام میں مقدمہ قائم ہوا جس میں ۱۲۷۷ھ میں سزائے حبس دوام بہ عبور دریائے شور ہوئی۔ خدا خدا کر کے پانچ برس کے بعد رہائی کی صورت ہوئی۔ انھوں نے کئی قصیدوں اور قطعوں میں راہ کے مصائب اور جزیرہ انڈمان کے شدائد بڑے پر درد اور مؤثر انداز میں بیان کئے ہیں۔

منیر کی تصانیف میں چند مذہبی رسائل کے علاوہ تین دیوان ہیں جن کے تاریخی نام منتخب العالم (۱۲۶۴ھ) تنویر الاشعار (۱۲۷۰ھ) اور نظم منیر (۱۲۹۰ھ) ہیں۔ دو مثنویاں بھی ان سے یادگار ہیں۔ حجاب زناں اور معراج المضامین۔ ان کا کلام تمام اصناف شعر پر حاوی ہے۔ اشعار کی تعداد تیس ہزار تک پہونچتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں متعدد غزلیں، خطوط اور تقریظیں بھی لکھی ہیں جن سے ان کا استادانہ کمال ظاہر ہے۔

ان کی شاعری پر اظہار رائے کرتے وقت ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ ان کی کلیات ایک پُر بہار باغ ہے جس میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں اور پھولوں کی خاطر ہمیں کانٹوں سے بھی تعرض کرنا ہوگا۔ بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید۔ پھولوں سے ہماری مراد وہ کلام ہے جس میں خیال کی لطافت انداز کی بداعت سے ہم دوش ہے اور کانٹوں سے مقصود ایسی شاعری ہے جو صنعت گری اور لفاظی کی حامل ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث نے بالکل درست کہا ہے کہ "ناسخ کے سلسلے میں یہ پہلے شخص ہیں جن کے کلام میں اپنے استاد کے علاوہ اپنا ایک خاص رنگ بھی موجود ہے"۔[۵] یہ خاص رنگ کیا ہے ہم آئندہ عرض کریں گے۔ پہلے یہ دیکھئے کہ وہ ناسخ کی طرح خیالی مضامین، خارجی لوازم، ابتذال اور صنائع کے کتنے دل دادہ ہیں۔ طویل غزلیں جن میں قافیہ پیمائی کا اہتمام اور مشکل قوافی و ردیف کا التزام ہے، ان کے یہاں کثرت سے ہیں۔ لیکن جب منیر ناسخیت سے ذرا ہٹ کر اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں تو شعر لطف دے جاتا ہے۔ اس رنگ کی خصوصیات ہیں ندرتِ اسلوب، تشبیہ و استعارہ اور نازک خیالی جو کبھی کبھی حقیقت کی حدود کو چھو لیتی ہے۔ مثلاً

پیری کہے ہے صبح شام جوانی کے واسطے ‏ ‏ ‏ مہمان شمع حسن بتاں رات بھر کی ہے

---

۵ تاریخ ادب اردو۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری وغیرہ۔

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں ۔۔۔ یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے
طفلی کی جوانی میں بھی راحت نہیں ملتی ۔۔۔ جو کھیل میں کھوئی ہے وہ دولت نہیں ملتی
کیا ہاتھ مرے بیہودگیں گے دامانِ تباں تک ۔۔۔ اپنے ہی گریباں سے فرصت نہیں ملتی
اللہ رے زورِ قلمِ صانعِ قدرت ۔۔۔ تصویر سے تصویر کی صورت نہیں ملتی

واقعہ یہ ہے کہ یہ نازک تشبیہات و استعارات کی فراوانی، یہ لطفِ کلام اور یہ زورِ بیان دوسروں کے یہاں مشکل سے ملے گا۔
فارسی و اردو غزل پر عدم تسلسل کا الزام لگایا جاتا ہے مگر منیرؔ کی متعدد غزلیں اول سے آخر تک مسلسل ہیں۔ مثلاً

جس بزمِ جاں فزا میں ابھی کل کی بات ہے ۔۔۔ خالی سرور سے دلِ پیر و جواں نہ تھا (۲۳ شعر)
دل توشۂ مردہ ہے داغِ غم گلستاں ہوں تو کیا ۔۔۔ آنکھیں روتی ہیں دہاں زخم خنداں ہوں تو کیا (۴۹ شعر)

جن میں نہایت واضح اور مؤثر انداز میں انقلابِ روزگار کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اسی طرح

کیوں اشارے کرتے ہیں ابرو کماں برسات میں ۔۔۔ تیروں کی بوچھار ہوتی ہے کہاں برسات میں (۷۸ شعر)

اور

اے فلک مانگی تھیں کس نے تجھ سے بھاری بیڑیاں ۔۔۔ گیسوے جاناں کی پہنا پیاری پیاری بیڑیاں (۱۲ شعر)

طویل غزلیں ہیں۔ ایک میں برسات کے مناظر اور دوسری میں قید کے شدائد بیان کئے ہیں۔
مضمون آفرینی اور قافیہ پیمائی منیرؔ کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے چناں چہ ایک طویل غزل میں گریباں کا قافیہ عطف و اضافت کے ساتھ صرف ۳۰ جگہ باندھا ہے۔ اس پُرگوئی سے یقیناً کوفت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ کوئی لطیف استعارہ لاتے یا تجسیم (Personification) سے کام لیتے ہیں تو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔
منیرؔ نے بزرگانِ دین اور رؤسائے وقت کی مدح میں کافی قصیدے لکھے ہیں اور قصیدے کے جو لوازم ملنے گئے ہیں وہ ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ تشبیب میں تخلیل کا جوش اور علمیت کا زور۔ گریز میں بداعت و ندرت۔ مدح میں مبالغہ اور بلند پروازی جو اس عہد تک سرمایۂ کمال سمجھی جاتی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ان سے پہلے سوداؔ اور ذوقؔ مدحیہ قصیدے کے استاد تسلیم کئے جاتے تھے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ذوقؔ کے قصائد میں وہ زورِ تخیل اور شکوہ بیان نہیں۔ سوداؔ کے یہاں تخیل کی فراوانی ضرور ہے مگر ناہمواری اور بندش کی سستی گراں گزرتی ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ دونوں کے زمانوں میں سو برس کا بُعد ہے۔
سوداؔ کی زمین میں منیرؔ کا ایک معرکہ آرا قصیدہ ہے جو مصائبِ قید کے بیان میں ہے۔ یہ خیالات کی تلاش، اسلوب کی متانت اور بیان کی صفائی میں بہت بلند پایہ ہے۔ افسوس کہ طوالت کے خیال سے اشعار نقل کرنا ممکن نہیں، صرف حوالے پر اکتفا کی جاتی ہے مطلع یہ ہے:

رُخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغضِ نہانی ۔۔۔ صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبحِ پیشانی

ایک اور قصیدہ جس کا آغاز ہے

نورِ خورشید جو ہو صاعقۂ طورِ حمل ۔۔۔ موسیٰ روز کرے مصر دلِ شب میں عمل

یہ اساتذۂ فارسی و اردو و نیز سوداؔ کی زمین میں ہے اور مرعوب ہے۔ آخر میں کہتے ہیں

اس زمانے میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے ۔۔۔ کہ مصیبت میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل

روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل

یہ قصیدہ ۵۷ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔

سب سے عجیب وہ قصیدہ ہے جو جزیرہ انڈمان میں مولانا فضل حق خیر آبادی اسیر قیدِ فرنگ کے ایما پر نظم کیا گیا تھا۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ استعارات و کنایات عجم شعرائے ہند کے بس کی چیز نہیں جس پر منیر نے یہ قصید قلم بند کیا۔ مگر اس کے ختم ہونے سے پہلے مولانائے مرحوم کی زندگی ہی انڈمان میں ختم ہو گئی۔

ایک الزام جو اردو شاعری پر اکثر لگایا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں مقامی رنگ نہیں ملتا۔ شاعر رہتا تو ہے دوآبہ میں، مگر جب روتا ہے تو اس کی آنکھوں سے جیحوں و سیحوں بہتے ہیں۔ منیر کے ایک قصیدہ کے چند شعر دیکھئے جن کو پڑھ کر معترض کو یہ الزام واپس لینا پڑے گا۔ یہ قصیدہ نواب کلب علی خان والیٔ رام پور کی تعریف میں ہے اور اس میں رام پور کے دربار کے مختلف اہلِ کمال کا بھی تذکرہ آ گیا ہے۔ تمہید کے اشعار یہ ہیں:-

رُت ہے برسات کی بہت پیاری موج زن جھیلیں، ندیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر زرد اودی سنہری زنگاری
کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے سبز مخمل سے بھی سوا پیاری
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں پُروائی لہر میں لیتی ہیں ندیاں ساری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں روح پر رہتی ہے خوشی طاری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب کر رہے ہیں نظر کی دلداری
سوندھی سوندھی زمیں کی مٹی بھینی بھینی چمن کی بو پیاری
ہنستی پھرتی ہیں باغ میں پریاں نہریا جوئے شیر ہے جاری
مہندیوں سے ہتیلیاں گلنار ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری
پہنے ہیں رنگ رنگ کے جوڑے دست نازک میں پانیچے بھاری
تھمبے چاندی کے، ریشمی جھولے ساز عشرت کی گرم بازاری
طبلے سارنگیاں ہیں ہم آواز گونجتا ہے سپہر زنگاری
گا چکی ہیں منیر کی غزلیں اب ہے ساون ملار کی باری
پکتی جاتی ہیں پوریاں پکوان تحفہ تحفہ مٹھائیاں ساری

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر زورِ تخیل کے ساتھ محاکات پر مضمون آفرینی کے ساتھ فطرت نگاری پر اور مشکل گوئی کے ساتھ سادہ نویسی پر بھی یکساں قدرت رکھتا ہے۔

منیر نے (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) دو مثنویاں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ حجاب زناں اور معراج المضامین۔ حجاب زناں اصلاحی مثنوی ہے جو لڑکیوں کی تربیت کے مسئلے سے متعلق ہے۔ اول تو اس میں کوئی ادبی حسن نہیں ہے دوسرے اس کے بارے میں کافی کہا جا چکا ہے اس لئے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ خود منیر نے بھی اس کو دل لگا کر نہیں لکھا تھا۔

کچھ گر ہستوں کی تھی یہ فرمائش ہوئی صفحے کی اس سے آرائش

حال جو کچھ سنا کیا موزوں　　نہیں اس میں لطافتِ مضموں
اپنے لہجے میں یہ کلام نہیں　　جب تو اس میں وہ التزام نہیں
سیدھی سیدھی زباں ہے اس میں　　سادہ سادہ بیان ہے اس میں

البتہ ان کی مثنوی معراج المضامین ایک بے نظیر اور ساتھ ہی گمنام نظم ہے جس کا مختصر تعارف یہاں ضروری ہے۔ منیر کو اس مثنوی پر بجا ناز تھا۔ اکثر امراء کو خطوط میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

بہت خونِ جگر کھایا ہے میں نے　　تب اس کو نظم کر پایا ہے میں نے
کمالِ رزم و بزم ایسا ہے موزوں　　کہ جس میں نظم ہیں بے مثل مضموں

اس کا موضوع مذہبی ہے اور حضرت رسولؐ خدا اور آپ کی آلؑ اطہار کے معجزات پر مشتمل تخیل کی ندرت، تشبیہات و استعارات کی جدت فارسی تراکیب کا لطف اور بیان کا شکوہ دیکھ کر منیر کی استادی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ چند اشعار سے مثنوی کا پورا پورا اندازہ ہونا دشوار ہے تاہم یہاں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یوں تو پوری نظم رفعت مضامین اور ندرت بیان کی شاہکار اور طرزِ منیر کی آئینہ دار ہے۔ لیکن بعض حصے تو لاجواب ہیں۔ مثلاً حمد، نعت، معراج، مناجات، رزم، بزم، بہار، خزاں، کوہ، دریا۔ مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خداوندا ترا عبد اقل ہوں　　اسیرِ حلقۂ طول امل ہوں
سبق خوانِ کتاب بے زبانی　　زمیں گیرِ بساطِ ناتوانی
غبارِ خاطرِ تازی و فرسی　　متاعِ کاروانِ کس مپرسی
سخن سنجِ زبانِ ناسپاسی　　فسادِ عالمِ ناحق شناسی
سرِ سرکش نہیں سجدے سے واقف　　گر ابھی ہوں تو قبلے سے مخالف
وظیفہ ہے مرا شعر و معمّا　　نماز و روزہ اسم بے مسمّا
صبوحی صبحدم اپنا وظیفہ　　بیاضِ گردنِ مینا صحیفہ
مری مسجد ہے ہر محرابِ ابرو　　تلاوت ہیں ہمیشہ مصحفِ رو
نمازِ صبحِ رُخ کس دن قضا کی　　تراویحِ شبِ گیسو ادا کی
گلابی ہے مرے تقویٰ کا جامہ　　ردائے دخترِ رز ہے عمامہ
رہِ عصیاں میں آوارہ ہوں یارب　　غلامِ نفسِ امّارہ ہوں یارب
خرابی کی جو بستی ہے تو مجھ سے　　عروجِ بخت پستی ہے تو مجھ سے
میں ہوں مفلس کا دن بے خواب کی شب　　سحر پروانے کی، سرخاب کی شب
مکانِ بند کے در پر اڑا ہوں　　دکانِ فقر میں گروی پڑا ہوں
نشانہ تیرِ آفت کا جگر ہے　　ٹھکانا مرگِ نو کا میرے گھر ہے
نحوست سے جو سن پایا ہم آغوش　　سعادت ہو گئی شرما کے روپوش
بنایا شور بختی کا نمک خوار　　رہے آبادِ بے کاری کی سرکار

اداسی کی جگہ دیوار و در میں — خزانہ مفلسی کا میرے گھر میں
نہیں بھاتی مجھے خلوت کسی کی — پسند آئی ہے صحبت بے کسی کی
ٹھکانا بے دیاری کا ہے مجھ سے — بھرم بے اعتباری کا ہے مجھ سے
پڑا ہے طالع ناکام سے کام — وثیقہ بے زری کا ہے مرے نام
نہیں ہے آبرو کچھ میری صلا — مگر اتنی کہ اشکِ چشم عنقا
نہ عزت ہی نے موریٔ لنگ سمجھا — مجھے تو عار نے بھی ننگ سمجھا

ممکن ہے کہ آپ اس طوالت سے اکتا گئے ہوں۔ اس لئے منہ کا مزا بدلنے کے لئے دریا کے گھاٹ کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ مقامی رنگ، مشاہدۂ فطرت، بیان کی صفائی اور روانی کی ایسی مثالیں اردو میں کمیاب ہیں۔ منیر کے معاصرین میں تسلیم تو ایک بڑی حد تک ان کے قریب پہونچتے ہیں اور بس

کنارِ آب انبوہ حسیناں — ہر اک جانب ہجوم مہ جبیناں ہے
سنہری تھالیاں چوک سے روشن — بتاسے دوب تلسی دھوپ چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول — گلوری کالے تل سیندور گو گل
چڑھاتی ہیں نہانے میں لب آب — جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
فلک پر ڈوبتے دیکھے ستارے — لبِ دریا چمکتے چاند تارے
کوئی گوری ہے کوئی سانولی ہے — کہیں جمنا کہیں گنگا جلی ہے
نہانے دھونے میں بھی چلبلاپن — ٹپکتا تھا میان آب جو بن
بھرے مانگوں میں سیندور اور صندل — گلابی مدبھری آنکھوں میں کاجل
گندھی زلفیں، بندھے جوڑے، کھلے بال — کہیں سمٹا کہیں پھیلا ہوا جال
نشیلی انکھڑیاں، نیچی نگاہیں — پھنسا لینے کی بہکانے کی راہیں
بھنویں جیتی بڑی آنکھیں بھرے بال — یہ ریشم کے لچھے سنبلیں بال
نگہ سے سرمہ ساں دل ہیں ڈالیں — بتا دیں ہنس کو چلنا یہ چالیں
ادا سے بوٹی بوٹی کا پھڑکنا — بگڑنا خود بخود رکنا جھجکنا
ہنسی میں آپ ہی وہ لوٹ جانا — پھر آپ ہی شرم سے گردن جھکانا
دم صبح اس غضب کا رنگ و روغن — نہ دیکھا باسی پھولوں پر یہ جوبن
طراوت تھی پسینے سے بدن کی — چلی آتی تھی خوشبو جیسے بن کی
اداسی جاگنے کی چتونیں مست — کبھی سینہ کبھی چہرہ تہِ دست
زبانیں خشک نیندیں چھا رہی تھیں — لبوں کی سرخیاں پپڑا رہی تھیں
جماہی لینے میں منہ کا یہ معمول — کبھی کچی کلی تھی گر کھلا پھول
کوئی انگڑائی لے کر ٹالتی تھی — کوئی سستی کسی پر ڈالتی تھی

دوسرا منظر

مہنت اک سمت کو دھونی رمائے　　کہیں جوگی جٹا سر پر بڑھائے
ملے منہ پر بھبھوت آنکھیں کئے لال　　بچھائے ہیں ہرن کی، شیر کی کھال
کوئی بیٹھا ہوا آتش کے اندر　　کسی کا دستِ خشکیدہ ہوا پر
کوئی تونبا اٹھائے کوئی مالا　　بچھائے کوئی اپنا مرگ چھالا

ان کے علاوہ کلیات میں باقی اصناف شعر بھی موجود ہیں۔ قطعات کچھ حسب حال ہیں جیسے

فرخ آباد اور یارانِ شفیق ہ　　چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم　　سو طرح کی ذلت و تحقیر سے

۴۶ اشعار میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس زمانے کی قید اور قید خانے کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ دیگر قطعات اپنے معاصرین کی تاریخ ہائے وفات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

رباعیات میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ عموماً روایات یا خاص الفاظ سے فائدہ لیا ہے۔ مثلاً

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا　　زہرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر　　کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

ایضاً

کیا قحط میں آ گئی تباہی امسال　　پیاسے مرتے ہیں مرغ و ماہی امسال
شبنم سے بھی ہے باغِ جوانی محروم　　کیونکر بھیگیں مسیں الٰہی امسال

یہ تھا مختصر تعارف منیر شکوہ آبادی کا جنہوں نے غزل میں رنگِ ناسخ کی کوتاہیوں کے باوجود اپنی طباعی سے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی اور قصیدہ و مثنوی میں تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے اس لئے اگر انہوں نے اپنے اسلوب کی نسبت یہ کہا تھا کہ

عاشق ہوں منیر اپنے ہی اندازِ سخن کا　　وارفتہ کسی کا ہوں نہ دیوانہ کسی کا

تو اس کو تعلی نہیں بلکہ خود شناسی پر محمول کرنا چاہئیے۔

صرف ۴۶ انسانوں کا گاؤں

تیجبو جاوا کا مقدس ترین گاؤں مانا جاتا ہے جس کی آبادی ۴۶ نفوس سے کبھی زیادہ بڑھنے نہیں دی جاتی۔ کسی باہر کے آدمی کو اس گاؤں میں قدم نہیں رکھنے دیا جاتا نہ ہی حکام اس گاؤں میں آسکتے ہیں۔ ۴۶۰۰ سال سے اس عقیدہ کی تقلید کی جا رہی ہے۔ گاؤں کے مکھیا کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر گاؤں کی آبادی کسی طرح ۴۶ نفوس سے زیادہ بڑھے تو وہ نومولود کو موت کے گھاٹ اتار دے یا اس کے والدین کو...

تصانیف مولانا نیاز فتح پوری

انتقادیات
مولانا نیاز فتح پوری کے معرکۃ الآرا ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ہر مقالہ اپنی جگہ حرف آخر اور معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اردو زبان اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔
قیمت:۔ چار روپے ۵۰ پیسے۔

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ
مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتدا، مذہب کا فلسفہ وارتقا، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔
قیمت:۔ ایک روپیہ ۷۵ پیسے

مشکلاتِ غالب
غالب کے تمام مشکل اشعارِ اردو کا نہایت صاف و صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔
قیمت:۔ دو روپے

عرضِ نغمہ
ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا۔ وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ معہ ایک بسیط مقدمہ کے۔
قیمت:۔ ایک روپیہ

ترغیباتِ جنسی
مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات، ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔
قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے

تاریخ کے گمشدہ اوراق
حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں ان افسانوں کے مطالعے سے واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دل کش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنہیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت:۔ دو روپے

جذباتِ بھاشا
مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ اور عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کرکے انکی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ایک شاعر کا انجام
حضرت نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جس سے افسانہ نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اس کا ایک ایک جملہ حسن وعشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اسکی نظیر نہیں ملتی۔ قیمت ایک روپیہ

نقاب اُٹھ جانے کے بعد
حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت اور علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت اجتماعی حیات کے لیے کس درجہ سم قاتل ثابت ہوتا رہا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

شبنمستان کا قطرہ گوہریں
مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔
قیمت:۔ ایک روپیہ پچیس پیسے

منیجر نگار پاکستان۔ ۳۷ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳۲

دُرگاوتی

عہدِ اکبری کی ایک رانی

سرفراز نیازی

درگاوتی مہوبا کے گونڈ راجہ کی بیٹی تھی اور اپنے غیر معمولی حسن و جمال کے لحاظ سے بڑی شہرت رکھتی تھی۔ سنگل گڑھ کا راجہ دلپت سنگھ اس کا نادیدہ عاشق تھا۔ (یہ ایک چھوٹی سی کوہستانی ریاست تھی جو گڑوا اور سنگر کے درمیان واقع تھی) لیکن اس کا پیام اس لئے رد کردیا گیا کہ وہ چندیلا راجپوت تھا اور درگاوتی زیادہ اونچے راجپوت خاندان کی لڑکی تھی، علاوہ اس کے وہ کسی دوسرے راجہ سے منسوب بھی ہو چکی تھی۔ دلپت سنگھ بہت خوبصورت انسان تھا اور دُرگاوتی اس کی طرف مائل تھی لیکن خاندانی فرق و امتیاز اور نسبت سابقہ کی دیوار ایسی حائل تھی کہ اس کا توڑنا آسان نہ تھا۔

آخر کار درگاوتی نے دلپت سنگھ کو کہلا بھیجا کہ "یا تو تم شادی کا خیال ترک کردو یا پھر فوج کشی کرکے مجھے حاصل کرو"

یہ پیام پہونچتے ہی دلپت سنگھ نے راجپوتوں کی ایک اچھی فوج آراستہ کرکے مہوبا پر حملہ کردیا اور درگاوتی کے باپ اور منگیتر دونوں کو شکست دیکر اپنی محبوبہ کو سنگل گڑھ لے آیا۔

چار سال بعد دلپت سنگھ مر گیا۔ اور چونکہ اس کا بیٹا بیر نرائن صرف تین سال کا تھا۔ اس لئے ریجنٹ کی حیثیت سے درگاوتی نے ریاست کا کام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کامل چودہ پندرہ سال تک بڑے سکون سے حکومت کرتی رہی۔

جب آصف خاں کڑہ مانک پور کا گورنر ہو کر آیا اور اس نے سنگل گڑھ کی دولت کے حالات سنے تو اس نے فوج کشی کردی (۱۵۶۴ء)

رانی درگاوتی نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گئی۔ اس کی آنکھ ایک تیر کا نشانہ بن چکی تھی اور اس کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اس وقت صرف اٹھارہ سال تھی۔ بُری طرح زخمی ہو گیا تھا اسے فوج کے عقب میں کردیا گیا تھا اثنا میں ایک دوسرا تیر رانی کی گردن میں آکر پیوست ہو گیا۔ اپنے سپاہیوں کو فرار ہوتے اور دشمن کو اپنے قریب تر ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنے فیلبان کا خنجر چھین کر اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔ اس کا بیٹا رزمگاہ سے باہر لیجایا گیا اور دشمن کی نظریں بچاتے ہوئے چوراگڑھ کے محل میں بھیجدیا گیا۔ آصف خاں نے اپنی کامرانی کے فوراً ہی بعد وہاں پہونچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ نوجوان شہزادہ قتل ہو گیا اور عورتوں نے محل میں آگ لگادی۔ اس خیال کے پیش نظر کہ مبادا

دشمنوں کے ہاتھ میں آکر انھیں رسوائی و ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

دو عورتوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی جان بچالی تھی ایک تو رانی کی بہن اور دوسری ایک نوخیز شہزادی جو نوعمر شہزادہ بیر نرائن سے منسوب ہو چکی تھی ان دونوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کے حضور میں بھیج دی گئیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ درگاوتی نے ایک عمارت مدن محل کے نام سے تعمیر کرائی تھی جس کے آثار اب بھی جبل پور میں موجود ہیں۔

جب یہ سارا علاقہ حکومت برطانیہ کی تحویل میں آگیا تو کسی پنڈت نے محل کے صدر دروازہ پر مندرجہ ذیل سطور لکھ دیں:-

"مدن محل کی چھائیں میں
دو ٹانگوں کے بیچ
گڑا نو لکھ روپے
اور سونے کی دو اینٹ"

دروازے پر اس تحریر کے نمایاں ہوتے ہی تھوڑے ہی عرصے میں اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اور Captain Wheatley نے جو اس وقت جبلپور میں پولٹیکل اسسٹنٹ کے عہدے پر مامور تھا کھدائی کا کام شروع کرا دیا۔ اس امید پر کہ یہاں کوئی خزانہ دفن کیا گیا ہے۔

یہ قطعہ زمین جس پر عمارت قائم ہے گاؤں کی ایک عورت کی ملکیت تھی وہ گھبرائی ہوئی گورنر جنرل کے ایجنٹ کے پاس آئی اور شکایت کی کہ اس کا خزانہ کیپٹن ہوٹلے کے ہاتھوں لٹ گیا۔ سر ولیم سلیمان (Sir Wm. Sleeman) نے ہنس کر جواب دیا کہ

" پگلی، وہ بھی ایسا ہی پاگل ہے جیسی کہ تو، اگر واقعی کوئی ایسی بات ہوتی تو پنڈت اس راز کا انکشاف کبھی نہ کرتا"

مدت گزر گئی بہت سے دوسرے لوگ بھی پنڈت کے جال میں پھنسے، اور عمارت کے قرب و جوار میں متعدد بار کھدائی ہوئی لیکن ملا کچھ بھی نہیں۔

اردو رباعی

فرمان فتحپوری کا علمی و ادبی شاہکار۔
جس میں رباعی کے فکر و فن، تاریخ و تنقید اور اس کی رفتار ارتقا پر سیر حاصل بحث کی گئی اس کتاب میں وہ سب کچھ شامل ہے جو رباعی کے صنف و موضوع کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اردو فارسی میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں رباعی کے فنی و تاریخی ارتقا پر محققانہ اور عالمانہ انداز سے بحث کی گئی ہے۔
قیمت:- پانچ روپے (مع محصولڈاک)

فارسی مثنوی نگاری اور داستان وامق وعذرا

نیاز فتحپوری

کل ایک صاحب تشریف لائے اور تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھار مجھ پر شروع کردی۔

(۱) یہ دو مصرعے کس کے ہیں۔ (۲) نان خطائی کی اصلیت کیا ہے۔ (۳) ملا دو پیازے کے جھگڑے بیربل کے ساتھ کس حد تک صحیح ہیں۔ (۴) فارسی میں مثنوی کا آغاز کب سے ہوا اور "وامق وعذرا" کی داستان کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں تو میں نے بتا دیا کہ ایک مصرع قتیل کا ہے اور دوسرا وحشی کا۔ دوسرے سوال کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ جب آپ نان خطائی میرے سامنے لائیں گے اس وقت غور کروں گا۔ تیسرے سوال کے جواب میں، میں نے انھیں بتایا کہ ملا دو پیازہ کے زمانہ کو بیربل یا اکبر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظام الملک آصف جاہ کا مصاحب تھا اور سفر وحضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ عبدالمومن نام تھا اور وطن دہلی باپ کا نام عبدالولی تھا۔ ایک بار جب نظام الملک بھوپال سے قریب دریائے نربدا کو عبور کر رہا تھا تو ایک گاؤں ہنڈیاں میں قیام کا اتفاق ہوا۔ ملا دو پیازہ کو یہ جگہ بہت پسند آئی اور اپنے آقا سے کہا ملاّ دو پیازہ کو تو اب ہنڈیاں ہی میں رہنے دیجئے۔ نظام الملک نے اس کی بات مان لی اور اسے وہیں چھوڑ کر چلدیا لیکن یہ گاؤں اس کی جاگیر میں دے دیا۔ ملا اور اس کی بیوی دونوں نے یہیں انتقال کیا اور ان کا حجرہ جس میں یہ دونوں مدفون ہیں اب تک موجود ہے۔ عہد اکبری کے ملا دو پیازہ کا نام عبدالقادر تھا اور اس کا ہنڈیاں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

چوتھے سوال کا جواب تفصیل طلب تھا اس لئے میں نے ان سے کہدیا کہ آپ اس کے لئے ۲۹ اکتوبر کے "جنگ" کا انتظار کیجئے۔

وامق وعذرا لیلیٰ مجنوں۔ خسرو شیریں۔ یوسف زلیخا۔ فارسی کی بہت مشہور مثنویاں ہیں اور متعدد شعراء نے ان فسانہائے عشق کو منظوم کیا ہے انھیں مثنویوں کے ساتھ وامق وعذرا کا نام بھی کبھی سننے میں آجاتا ہے۔ گو اس نام کی مثنوی میری نگاہ سے کبھی نہیں گزری۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ مثنوی لکھی ہی نہیں گئی یہ اور بات ہے کہ اب وہ نایاب ہو چلی ہے۔

آپ نے عنصری کا نام تو سنا ہوگا جو فردوسی کا ہمعصر اور محمود غزنوی کا درباری شاعر تھا۔ غالباً سب سے پہلے اس نے مثنوی "وامق وعذرا" تصنیف کی اور اس کے بعد بہشتی اور لامعی نے جو ترکی شاعر تھا۔ اس مثنوی کا جو پلاٹ لامعی کی مثنوی میں پایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فسانہ کا تعلق یکسر زمین ایران سے ہے۔

"وامق کسی آتشکدہ کا مغ تھا اور عذرا ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے آتشکدہ کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ ان دونوں میں محبت ہوگئی۔ لیکن چونکہ یہ محبت مذہباً ممنوع تھی۔ اس لئے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ عذرا شمال کے برفستان میں بھیجدی گئی اور وامق کو افریقہ کے کسی نہایت گرم حصہ کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ آخر کار دونوں گھل گھل کر مر گئے اور مرنے کے بعد عذرا نے ستارہ سنبلہ کی صورت اختیار کرلی اور وامق کی روح نے سماک رامح کی۔

لیکن ڈاکٹر ہیوارٹ (HUART) نے بحوالہ عوفی، دولت شاہ وبراؤن اس کا پلاٹ بالکل مختلف ظاہر کیا ہے۔

فغفورِ چین کا بیٹا کسی دوسرے بادشاہ کی بیٹی عذرا پر عاشق ہوگیا ہے اور بڑی دشوار گزار منزلیں طے کرنیکے بعد پریلو ہند دسے اسے پالیتا ہے۔ لیکن اسی وقت کوئی اور رقیب وامق کو پکڑ کر ہندوستان لے آتا ہے اور چتا روشن کرکے اسے جلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن آگ اس پر اثر نہیں کرتی اور ہندو اسے دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں اور یہ موقع پاکر بھاگ جاتا ہے۔"

ان دونوں پلاٹوں میں کافی اختلاف ہے لیکن آگ کا عنصر دونوں میں شامل ہے۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ یہ قصہ سب سے پہلے پہلوی زبان میں لکھا گیا تھا اس کے بعد عنصری نے اسے فارسی میں نظم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب اس کا پہلوی نسخہ عبداللہ بن طاہر امیر نیشاپور کی نگاہ سے گزرا تو اس نے اس کو جلوا دیا۔ کیونکہ وہ زردشت کا لکھا ہوا تھا لیکن یہ روایت زیادہ قابل اعتبار نہیں کیونکہ یہ امر بالکل یقینی ہے کہ اسے نہ صرف عنصری بلکہ اس کے بعد فصیحی نے بھی نظم کیا۔ اور حسب تحقیق مسٹر بیل فرخاری نے بھی اس کے بعد حسب بیان مسٹر ہوارٹ چھ مثنویاں اور اسی نام سے لکھی گئیں۔ لطف علی بیگ مولف تذکرہ آتشکدہ نے مرزا محمد صادق نامی کو بھی اسی نام کی ایک مثنوی کا مصنف ظاہر کیا ہے۔ بہرحال مثنوی "وامق وعذرا" کا کوئی غیر معروف مصنف نہیں ہے اور عنصری، لامعی، فرخاری یا نامی کی مثنویوں میں سے کوئی مثنوی مل جائے تو البتہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا پلاٹ واقعی کیا ہے اور ہندوستان کا ذکر اس میں کوئی الحاق واضافہ تو نہیں۔

فارسی میں عشقیہ مثنوی نگاری کا آغاز

فارسی میں مثنوی کا سب سے پہلا نمونہ حسب بیان دولت شاہ قدیم پہلوی زبان کی وہ بیت ہے جو قصر شیریں کے دروازے پر منقوش تھی اور جس کے دونوں مصرعے برابر کا قافیہ رکھتے تھے یہ کتبہ عضدالدولہ دیلمی کے زمانہ (۳۷۲ھ) تک موجود تھا۔ اس کے علاوہ وہ پہلوی زبان کی کوئی نظم ایسی دستیاب نہیں ہوئی ہے جسے مثنوی کہہ سکیں۔

فارسی میں مثنوی نگاری کا آغاز دراصل عہد اسلام سے ہوتا ہے۔ جب سب سے پہلے ناصر خسرو نے دو اخلاقی مثنویاں روشنائی نامہ اور سعادت نامہ نظم کیں۔ اس کے بعد حسب بیان عوفی فخرالدین گورگانی نے ایک عشقیہ مثنوی لکھی جس میں ایک موبد کی لڑکی کی داستان محبت بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ بالکل ابتدائی کوشش تھی لیکن اس کے بعد صحیح معنی میں اولین مثنوی نظامی نے مخزن اسرار کے نام سے لکھی جو اخلاقی نصائح سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے بعد پانچ عشقیہ مثنویاں لکھیں جو پنج گنج کے نام سے مشہور ہیں۔ خسرو وشیریں — لیلیٰ مجنوں۔ ہفت پیکر۔ یوسف وزلیخا اور سکندر نامہ۔ یوسف زلیخا کے نام سے فردوسی بھی ایک مثنوی چھوڑ گیا تھا اور جس حد تک مثنوی کی تکنیک کا تعلق ہے نظامی نے فردوسی ہی کا تتبع کیا ہے۔

نظامی کے بعد مثنوی نگاری میں جامی نے بڑا نام پیدا کیا اس کے بعد یہ ذوق اتنا عام ہوگیا کہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے کوئی نہ کوئی مثنوی نہ لکھی ہو یہاں تک کہ پوری تحقیق کے بعد بھی ان کا احصار دشوار ہے۔ عطار و رومی بھی مثنوی نگاری کے ائمہ میں شامل ہیں، لیکن ان کا میدان فکر اخلاق وتصوف تھا۔ جس کی پیروی بعد کو دوسرے شعراء نے بھی کی۔

ایران سے ہندوستان آنے والے شعراء میں مثنوی نگار کم تھے۔ ان کا فن غزل گوئی تھا اور قصیدہ نگاری بھی۔ ہندوستانی شعراء میں فیضی نے نل دمن لکھی۔ لیکن مقبول نہ ہوئی۔ البتہ امیر خسرو نے اس فن میں اپنا ڈنکا بجادیا۔ رزمیہ مثنویوں کو چھوڑ کر پانچ مثنویاں صرف عشق ومحبت کے موضوع پر لکھیں۔ شیریں وخسرو۔ مجنوں ولیلیٰ۔ ہشت بہشت، قران السعدین — دولرانی خضر خاں۔ اور جس طرح ہاتفی کی مثنوی یوسف وزلیخا اس موضوع پر بہترین مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح خسرو کی مجنوں ولیلیٰ اپنے موضوع کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی۔ جب لیلیٰ مرجاتی ہے اور اس کے اعزا اس کو دفن کرتے ہیں تو اس منظر کا ذکر اس وقت کے تمام تاثرات کو لئے ہوئے اس شعر پر ختم کردیتے ہیں:

گریاں جگر زمیں کشادند　　واں کان نمک درو نہادند

(جنگ کراچی)

باب الاستفسار

(۱)

کس کے اشعار ہیں

عبدالسلام خاں۔ فریدکوٹ

ایک زمانے سے یہ دو مصرعے ذہن میں محفوظ ہیں۔ لیکن اب بالکل یاد نہیں کہ کس شاعر کے ہیں اور کس غزل یا قطعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مطلع فرمایئے۔

غزل کا مصرعہ یہ ہے۔

ماراچو دید لغزش پارا بہانہ ساخت

اور قطعہ کا مصرعہ یہ ہے۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام ازانِ من

یہ قطعہ کسی شاعر نے مزاحیہ انداز میں تقسیم ترکہ کے سلسلے میں لکھا تھا۔

(نگار) پہلا مصرعہ قتیل کی ایک مشہور غزل کا ہے۔ جس کے صرف چار شعر مجھے یاد ہیں۔ اس کی ردیف "رابہانہ ساخت" ہے اور قافیہ حیا، ادا وغیرہ۔

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت — خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت
دستے بدوشِ غیر نہاد از سرِ کرم — ماراچو دید لغزشِ پا را بہانہ ساخت
رفتم بہ مسجدے کہ بہ بینم جمالِ دوست — دستش برُخ کشید و دعا را بہانہ ساخت
عاشق کشی چو کرد شدہ است دیاش سُرخ — ویں طرفہ مکر بیں کہ حنا را بہانہ ساخت

واضح رہے کہ قتیل نے یہ غزل میلی کے تتبع میں کہی تھی جس کے بعض اشعار ایک ہی قافیہ کے یہ ہیں۔

غافل بمن رسید و وفا را بہانہ ساخت — افگندہ سر بہ پیش و حیا را بہانہ ساخت
تا از جفائے او نہ رہم خون من نہ ریخت — بے رحم بیں کہ ترس خدا را بہانہ ساخت
از بزم ناز آمدن من بروں ردد — برخاست گرم و داد ن جا را بہانہ ساخت

دونوں غزلیں مہمل ہیں فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ قتیل کی غزل اگر لغو ہے تو میلی کی لغوتر۔

وہ قطعہ جس کا آپ نے ایک مصرع تحریر کیا ہے۔ وحشی کا ہے یہ قطعہ بہت مشہور ہے۔

زیبا تر آنچہ ماندہ ز بابا ازانِ تو — بدائے برادر از من و اعلیٰ ازانِ تو
ایں طاس خالی از من واں کوزہ کہ بود — پارینہ[1] پر ز شہد مصفا ازانِ تو
یا بوئے ریسماں گسل و میخ کہن زمین — مہمیز کلہ تیز و مطلا ازانِ تو
آں دیگ لب شکستہ صابوں پزی ز من — آں کچہ ہریسہ و حلوا ازانِ تو
آں قوچ[2] شاخ کج کہ زند شاخ ازانِ من — غوغائے جنگِ قوچ و تماشا ازانِ تو
ایں استر[3] چموش[4] لگد زن ازانِ من — ایں گربہ مصاحب بابا ازانِ تو

از صحن خانہ تا بہ لب بام ازانِ من
از بام خانہ تا بہ لب بام ازانِ تو

اسی نظم کے تتبع میں میلیؔ اور رفیعی کاشانی نے بھی قطعات لکھے ہیں لیکن وہ اس پایہ کے نہیں۔

(۲)

شیریں، فرہاد و خسرو

(مرزا مراد بیگ صاحب اجین)

فرہاد، شیریں اور خسرو، ان تینوں کا نام ساتھ ساتھ آتا ہے۔ مثنویوں میں زیادہ تر خسرو و شیریں کی محبت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس افسانہ میں ان تینوں کا اصلی کردار کیا ہے اور ایک کا دوسرے سے کیا تعلق ہے۔ نیز یہ کہ خسرو تاریخ ایران کے کس عہد سے تعلق رکھتا ہے اور شیریں کون اور کیا تھی۔

(**نگار**) جس حد تک خسرو و شیریں کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی خاص بات ایسی نہیں کہ وہ کسی عشقیہ مثنوی یا رومان کی بنیاد ہو سکے۔ خسرو ایران کا بادشاہ۔ شیریں اس کی بیوی۔ چلیے قصہ ختم ہوا۔ اگر تسلیم بھی کر لیں کہ شیریں غیر معمولی حسن و جمال کی مالک تھی اور خسرو اس پر جان چھڑکتا تھا تو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ خدا جانے کتنے فرمانروا ایسے ہوئے ہیں جو اپنی بیویوں سے محبت کرتے تھے۔ لیکن مثنوی کے ہیرو کی حیثیت سے تو انھیں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی واقعہ مثنوی کے حدود میں اسی وقت آ سکتا ہے جب اس میں کسی المیہ کا عنصر شامل ہو اور "خسرو و شیریں" کے افسانہ میں یہ عنصر پیدا کیا فرہاد نے۔

خسرو و شیریں یا فرہاد و شیریں کا جو قصہ بیان کیا جاتا ہے اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے اظہار سے قبل تاریخی حیثیت سے بھی ان پر نظر ڈال لی جائے۔

سب سے پہلے خسرو پرویز کو لیجئے۔ ایران میں ہرمزد نام کے تین فرمانروا ہوئے ہیں۔ پہلے دو ہرمزد کا تعلق موضوع زیر بحث سے نہیں اس لئے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔ تیسرے اور چوتھے ہرمزد البتہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے آتے ہیں اگلائے تسلسل

---

[1] پارینہ بمعنی پچھلے سال [2] آں قوچ بمعنی مینڈھا [3] استر بمعنی خچر [4] چموش بمعنی اڑیل

بیان کے لئے مختصراً ان کا ذکر ضروری ہے۔

ہرمزد ثالث۔ آٹھواں ساسانی فرمانروا تھا جو سنہ ۴۵۶ء میں تخت نشین ہوا لیکن وہ ایک سال بھی حکومت کر چکا تھا کہ اس کے بھائی فیروز نے اسے قتل کر دیا (۴۵۹ء) اور خود تخت نشین ہوگیا۔ اسی بادشاہ کے سلسلے میں بعض مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ بہرام چوبیں اسی کا فوجی جرنل تھا جو ہرمزد ثالث کو معزول کر کے خود تخت نشین ہوگیا تھا۔ لیکن یہ درست نہیں، کیوں کہ بہرام چوبیں کا تعلق ہرمزد ثالث سے نہیں بلکہ ہرمزد رابع کے عہد سے تھا۔

ہرمزد رابع۔ یہ ساسانی فرمانروا وہی ہے جسے یونانی مورخین Hermisdas III کہتے ہیں یہ نوشیرواں کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔ اسی کے زمانے میں بہرام چوبیں نے بغاوت کی اور ہرمزد رابع کو (سنہ ۵۹۰ء) میں قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد اس کے بیٹے خسرو پرویز (جو مثنوی خسرو شیریں کا ہیرو ہے) قیصر روم "Maurice" کی مدد سے، بہرام چوبیں کو شکست دے کر خود تخت نشین ہوگیا (سنہ ۵۹۱ء) چونکہ یہ قیصر روم (Maurice) کا بہت ممنون تھا اس لئے وہ اسے اپنے باپ کی جگہ سمجھتا تھا۔ اس لئے جب تک وہ زندہ رہا یہ خاموش رہا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد ہی اس نے روم پر حملہ کر دیا اور شام کو فتح کر لیا۔ یروشلم تک پہنچ گیا اور وہاں کے کلیسہ کی تمام دولت لوٹ کر ایران لے آیا۔ اس کے بعد جب قیصر روم ہراکلیس نے ایران پر حملہ کیا اور رعایا میں اضطراب پھیلا تو خسرو کی طرف سے ملک میں عام بدظنی پیدا ہو گئی اور شیرویہ اس کے بڑے بیٹے نے اسے سنہ ۶۲۸ء (۷ھ) میں قتل کر کے عنان حکومت خود ہاتھ میں لے لی۔

یہی وہ خسرو پرویز تھا۔ جس کو (حسب بیان مورخین اسلام) رسول اللہ نے دعوت اسلام کا خط لکھا تھا اور جب اس نے اس خط کو چاک کر دیا تو رسول اللہ نے حکومت اکاسرہ کی تباہی کی پیش گوئی کی تھی (جو پوری ہوئی) اس خط کے بھیجنے کی تاریخ سنہ ۷ھ ہجری بتائی جاتی ہے جس کا آغاز ۱۱ مئی سنہ ۶۲۸ء سے ہوا تھا، لیکن گبن کی تحقیق یہ ہے کہ خسرو کا انتقال فروری سنہ ۶۲۸ء میں ہو چکا تھا اس لئے خط بھیجنے کا واقعہ سنہ ۶ھ کا ہونا چاہئے لیکن خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔

اب کچھ ذکر شیریں کا بھی سن لیجئے کہ وہ کون تھی۔ بعض کا بیان ہے کہ اس کا نام میری (Mary) تھا اور بعض آیرین (Irene) بتاتے ہیں (ہو سکتا ہے کہ آیرین کو ایران والوں نے شیریں کر دیا ہو) یونانی مصنفین اسے مسیحی ظاہر کرتے ہیں۔ اور ایران و ترکی کے فسانہ نگار اسے قیصر روم (Maurice) کی لڑکی ظاہر کرتے ہیں جس پر خسرو اسی وقت عاشق ہوگیا تھا جب ماریس نے بہرام چوبیں کے نکالنے میں خسرو کی مدد کی تھی۔

اب اس اختلاف کو بھی سن لیجئے جو اس قصہ کی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ۔ جب خسرو کو اس کے بیٹے نے قتل کر کے ایران پر قبضہ کر لیا تو اس نے شیریں کو بھی اپنے تصرف میں لانا چاہا۔ شیریں نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہ کسی طرح اپنے سوتیلے بیٹے کی بیوی بننے پر راضی نہ ہوئی لیکن جب اصرار نے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر لی تو اس نے کہا کہ۔ "بہتر ہے میں اس تعلق پر راضی ہوں بشرطیکہ آنکہ ایک بار اور مجھے خسرو کی لاش دیکھنے کی اجازت دے دی جائے"۔ چنانچہ اس کی یہ شرط منظور کر لی گئی اور جب وہ اپنے شوہر و عاشق کی لاش کے پاس پہنچی تو خنجر مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔

اس روایت میں فرہاد کا نام کہیں نہیں آتا، لیکن دوسری روایت میں ہے۔ اور وہ روایت یہ ہے کہ فرہاد ایران کا ایک نوجوان سنگ تراش تھا۔ اور شیریں کا دیوانہ۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو خسرو نے اسے قتل کر دینا چاہا لیکن

بہ اندیشۂ بدنامی یا اس لئے کہ شیریں خود فرہاد سے محبت کرتی تھی اور وہ قتل فرہاد پر راضی نہ تھی۔ خسرو نے یہ تدبیر اختیار کی کہ فرہاد کو بلا کر کہا کہ اگر تم کوہ بیستون کو کاٹ کر چشمہ کے بہاؤ کا رُخ بدل دو، تو شیریں تم کو مل جائے گی۔ (شعراء نے چشمہ آب کو نہر شیر۔ کر دیا) اس نے یہ شرط منظور کر لی اور پہاڑ کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ جب فرہاد کی سالہا سال کی کاوش کے بعد یہ کام تکمیل کی حد تک پہنچ گیا اور خسرو کو یہ اندیشہ پیدا ہوا مبادا شیریں سے ہاتھ دھونا پڑے اس نے ایک بڑھیا کے ذریعے سے فرہاد کو شیریں کے مرجانے کی خبر پہنچا دی اور اس نے چٹان سے نیچے گر کر یا تیشہ مار کر خود بھی اپنی جان دے دی۔ بعض کا بیان ہے کہ جب شیریں کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ "روایت اولیٰ" کا واقعہ اس روایت میں شامل کر دیا گیا ہو۔

"خسرو و شیریں" کے عنوان سے فارسی میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں اور فارسی کا شاید ہی کوئی مشہور شاعر ایسا ہو جس نے اس قصہ کو نظم نہ کیا ہو۔

(۳)

مُلتان کا تعلق حکومتِ دہلی سے

سید حیدر علی صاحب (ایبٹ آباد)

ملتان، ٹھٹھہ، بھکر وغیرہ سندھ کے بڑے مشہور تاریخی مقامات ہیں اور خدا جانے کس کس زمانہ میں کن کن ہندو مسلم خاندانوں نے یہاں حکومت کی ہے۔ لیکن صحیح طور سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت دہلی سے اس کا تعلق سب سے پہلے کب اور کیونکر ہوا۔

(نگار) ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں ہوا ہے۔ تواریخ سندھ کے مطالعے سے یہ بات تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہوگی کہ نویں صدی ہجری میں ملتان لنگاہ کے مسلم خاندانوں کے قبضے میں تھا (اس جگہ اس خاندان کے حالات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں) جب ۹۰۸ھ میں محمود خاں لنگاہ فرمانروائے ملتان کا انتقال ہو گیا تو اس کا لڑکا حسین لنگاہ اول تخت نشین ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی میں سکندر لودی حکمراں تھا اور ان دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اس کے ۵، ۶ سال بعد حسین لنگاہ ثانی تخت نشین ہوا (۱۵۲۴ء) جو نابالغ تھا، اور سارا نظم و نسق اس کے بہنوئی شجاع الملک کے اختیار میں تھا۔ اس وقت ٹھٹھہ میں شاہ حسین ارغون حکمراں تھا جس کے تعلقات ملتان سے اچھے نہ تھے۔ اس نے بابر کے اشارہ سے ملتان پر حملہ کر دیا۔ اور پندرہ ماہ کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا (۱۵۲۶ء) لیکن وہ خود یہاں نہیں رہا لشکر خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے ٹھٹھہ چلا گیا۔ اس کے بعد جب بابر نے اپنے زمانہ علالت میں ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تو ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو لاہور جاگیر میں دے دیا۔ کامران نے اس خیال سے کہ لاہور کے حدود ملتان سے ملتے ہیں۔ لشکر خاں کو طلب کیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کابل لیلے جس سے کامران کو اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی اور اس کے عوض ملتان دیدے۔ سرکار دہلی سے ملتان کے

متعلق ہونے کی یہ ہے تاریخ۔

---

(۴)

غالب تخلص رکھنے والے شاعر

عمر اکرم صاحب (لودھیانہ)

کیا مرزا اسد اللہ خاں کا تخلص غالب کوئی نیا تخلص تھا جو اس نے اختیار کیا۔ اگر نیا نہیں تھا اور اس سے پہلے بھی بعض شاعروں نے یہ تخلص اختیار کیا تو حیرت ہے کہ غالب ایسے خود دار شاعر نے دوسرا تخلص کیوں اختیار نہیں کیا؟

(نگار) غالب کوئی نیا تخلص نہ تھا۔ میں صحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ غالب سے پہلے کن کن شعراء نے یہ تخلص اختیار کیا تذکروں کے مطالعے سے اس کا پورا علم ہو سکتا ہے۔ لیکن کم از کم چار شاعروں کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے جو غالب سے پہلے اس تخلص کے حامل تھے۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے لیکن اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک شاعر محمد سعید کا بھی یہی تخلص تھا جس نے اپنا دیوان ۱۶۹۰ء میں مرتب کیا۔ اس کے بعد میر فخرالدین عہد محمد شاہ کے قصہ گو کا نام آتا ہے جو ۱۷۳۴ء میں زندہ تھا اس کے بعد شیخ اسد اللہ (شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بھانجے نے یہ تخلص اختیار کیا جن کا انتقال ۱۷۵۰ء میں ہوا۔

علاوہ ان کے مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ فرزند نواب نیاز بیگ خاں کا بھی یہی تخلص تھا جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں انتقال کیا۔ یہ فارسی ریختی دونوں زبان کے شاعر تھے۔

اب رہا یہ امر کہ غالب نے کیوں یہ تخلص اختیار کیا۔ اس پر مجھے بھی تعجب ہے۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ مرزا اسد اللہ خاں اپنے تمام پچھلے غالبوں پر غالب آگئے اور وہ پیشرو شعراء جنھوں نے پہلے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تو ماننا پڑتا ہے کہ اصل غالب وہی تھا جسے اس وقت بھی ساری دنیا جانتی ہے اور آئندہ بھی فراموش نہ کر سکے گی۔

نوٹ:۔ افسوس ہے کہ غیر معمولی مصروفیت کی بنا پر تمام استفسارات کا جواب تحریر نہ کر سکا۔ کوشش کروں گا کہ ان میں سے بعض کا جواب آئندہ اشاعت میں درج ہو سکے۔ نیاز

دلہن اُبٹن

جسم کو صاف اور نرم رکھتا ہے اس کے استعمال سے جلد زہریلے جراثیم سے پاک رہتی ہے خشکی کو دور کرتا ہے۔ رات کو مل کر سونے سے نیند خوب آتی ہے۔ صبح اٹھنے پر طبیعت مثل گلاب کے شگفتہ ہوتی ہے۔ مرد عورتوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

ملنے کا پتہ خاتون انڈسٹریل ہوم دھرمسی واڑہ لارنس روڈ کراچی ۳۲

منظومات

دل شاہجہانپوری

وہ جلوہ نمائی کا منظر وہ فرطِ تحیّر کا عالم
ہم پر تو غشی سی طاری تھی تم جنبشِ داماں بھول گئے

کیا ذکرِ شبابِ رفتہ کا اب تو یہی سمجھو تم اے دلِ زار!
اک خواب پریشاں دیکھا تھا وہ خوابِ پریشاں بھول گئے

مرا مدعا یہی تھا میری زندگی یہی ہے
کہ سمجھ رہی ہے دنیا مجھے ڈوبتا ستارا

یہ ہے سرگزشتِ گلشن رہے نذرِ برقِ سوزاں
کبھی بال و پَر ہمارے کبھی آشیاں ہمارا

وہ خموشیٔ محبت وہ نظر کی ترجمانی
جو زباں تک نہ آیا وہی راز آشکارا

یہ ہے جذبۂ محبت وہ کرشمۂ محبت
جسے پی گئے وہ آنسو جو ٹپک پڑا وہ تارا

یونہی دن گزر رہے ہیں یہی زندگی ہے اے دل
کبھی ہر نفس مصیبت کبھی ہر نظر سہارا

سجدوں کے عوض جنت کی طلب جنت میں تمنا کوثر کی
میکش کی نظر میں اے واعظ یہ سلسلۂ اوہام نہیں

یہ زلفِ مسلسل رخ کے قریں یہ حلقۂ کاکل کیا معنی
پابندِ سلاسل عشق ہی کیا حسن اسیرِ دام نہیں

راتیں بھی کٹیں دن بھی دیکھے ہر صبح تھی صبحِ ناکامی
پر نور جو کر دے نظروں کو قسمت میں وہی اک شام نہیں

جو کچھ بھی کہوں جب تک بھی کہوں اے اہلِ نظر سنتے رہیئے
یہ عشق و وفا کا ماتم ہے روداد دلِ ناکام نہیں

بالیں سے مریضِ فرقت کی کہتا ہوا کوئی گزرا ہے
یہ چند نفس کا مہماں ہے یا صبح نہیں یا شام نہیں

مے خانۂ عالم کا اے دل افسانۂ ماضی کیا کہیئے
وہ جوش نہیں مے نوش نہیں وہ دور نہیں وہ جام نہیں

مٹ گیا شیوۂ تسلیم و رضا میرے بعد
کوئی مفہومِ محبت نہ رہا میرے بعد

اے پشیمانِ جفا اب تو نہ کر ذکرِ وفا
تو نے کیوں قصّۂ دل چھیڑ دیا میرے بعد

خونِ مظلوم ہے خونِ دلِ ناکام نہیں
رنگ لائے گا یہ ہم رنگ حنا میرے بعد

اب کہیں تذکرۂ نعرۂ منصور نہیں
قصّۂ دار و رسن ختم ہوا میرے بعد

دل دھڑکتا ہوا پہلوئے غزل خواں میں نہیں
سرد ہے گرمیٔ بزمِ شعرا میرے بعد

ناکام محبت پر ہمدم یہ جفا کب تک
تسکین کے چھینٹوں نے اور آگ کو بھڑکایا

سمجھے تو یہی سمجھے دنیائے محبت میں
تو جان تمنا ہے دل کھو کے تجھے پایا

سوزِ جگر و دل کی روداد یہ ہے اے دل
اک داغ چمک اٹھا اک زخم ابھر آیا

نذرِ غالب

منظور حسین شور

فردا بسرِ حشر بغالب بکنم عرض
"تابش" بہ "قمر" "موج" بہ "عمان" چہ فروشم

اما تو بگو بر سرِ ایں بزمِ سفیہان
قرآنِ غم و مصحفِ عرفان چہ فروشم

در انجمنِ خیرہ سراں شعر چہ خوانم
ایں جنسِ گراں این قدر ارزان چہ فروشم

صحبت چہ کنم آہ بہ ہر عامی خود خواہ
خورشید بہ شمع تہِ دامان چہ فروشم

پردہ چہ کشایم ز رخِ معنیٔ ادراک
با تیرہ شبان نیرِ تابان چہ فروشم

آئینہ کجا در کفِ زنگی بگذارم
داغِ جگر و دل بہ یہود ان چہ فروشم

خفاش چہ داند تب و تابانیِ خورشید
کالائے ہنر را بہ حسود ان چہ فروشم

نغمہ چہ سرایم بحریفان گراں گوش
نورِ مہ و خورشید بکوران چہ فروشم

با تیرہ نہادان چہ کنم والبِ گفتار
باریگِ روان گوہرِ غلطانِ چہ فروشم

باکم نظران بر ہنرِ خویش چہ نازم
ایں معجزہ با شعبدہ بازان چہ فروشم

ہر غنچہ گلستاں بکنار ست ولیکن
با سبزۂ صحرا گل و ریحان چہ فروشم

ان بہ کہ بہرِ غنچہ زنم آتش در قصم
اسرارِ گلستان بہ بیابان چہ فروشم

با ساحلیان رازِ دلِ بحر چہ گویم
با قطرۂ نیساں یم و طوفان چہ فروشم

با بوریا بافان چہ زنم حرفِ زکمخواب
ابریشم و اکسون بگدایان چہ فروشم

با ذرّہ چہ گویم سخن از وسعتِ صحرا
نگینیٔ کہسار بہ موران چہ فروشم

ہر مرغِ ہوا درخور پروازِ فلک نیست
با کرمکِ شب عرصۂ گیہان چہ فروشم

با جہل چہ نسبت ادب و شعر و سخن را
با مور و ملخ اوجِ سلیمان چہ فروشم

ایں شپرّہ چشمان چہ بدانند سحر چیست
ایں نکتہ بایں شپرّہ چشمان چہ فروشم

تا چند زنم غازہ بہ رخسارِ سیاہان
با شیشہ گراں شاخۂ مرجان چہ فروشم

رنگِ حبشی با چہ رود چند بشوئیم
اخلاصِ حسیناں بہ یزیدان چہ فروشم

برگِ گلِ تر سینۂ خارا چہ شگافد
با اہلِ ریا دولتِ ایقان چہ فروشم

سجادہ چہ در معبدِ گبران بکشائیم
توحید بہ اصنام پرستان چہ فروشم

دل دولتِ دارین بود با کہ کنم عرض
ایں کعبہ بہر تاجرِ قرآن چہ فروشم

نا فہم چہ داند کہ سخن چیست و فن چیست
با برہمنان حرمتِ یزدان چہ فروشم

مرغانِ قفس بال بگردوں چہ کشایند
افکارِ اماماں بہ غلامان چہ فروشم

با تودۂ یخ آتشِ سوزاں چہ دہم شرح
با مرغِ سحر شہپرِ بازاں چہ فروشم

در شہرِ خموشاں چہ زنم زخمہ بہ سازے
با مردمِ کر نغمہ و الحان چہ فروشم

من بیخودِ ہشیارم و بدمستِ خود آگاہ
یاران ہمہ مستند بہ مستان چہ فروشم

این جا چہ مقام است و کجائیم کہ داند
بلبے خبر ان عالمِ وجدان چہ فروشم

بے تابم و بے خواب، و بے باکہ بگوئیم
با سنگدلان رقصِ رگِ جان چہ فروشم

کو محرمِ رازی کہ بداند تپشِ جان
در کوئی لئیمان تپشِ جان چہ فروشم

باگریہ ہمی خندم و با خندہ بنالیم
ترسم کہ بہ تنقید نگاران چہ فروشم!

نیاز فتحپوری

شورش کاشمیری

ادیب العصر لکھوں صاحبِ فہم و ذکا لکھوں
قلم کارانِ عصرِ حاضرہ کا رہنما لکھوں

ادب میں بوالکلام آزاد کی تصویر ٹھہراؤں
زباندانی میں میرؔ و میرزاؔ کا ہمنوا لکھوں

مری طبعِ رسا نے غائبانہ فیض پایا ہے
عزیزانِ گرامی اور کیا اس کے سوا لکھوں

حدیثِ دردِ دل کہہ لوں نیاز و ناز کی لے میں
غزل کے روپ میں افسانۂ مہر و وفا لکھوں

قلم کی نوک پہ دہلی کے افسانے بھی آتے ہیں
کبھی یہ سوچتا ہوں لکھنؤ کا ماجرا لکھوں

جو کچھ ان سے کیا بھوپال کی زہرہ جبینوں نے
لطیف الدین احمد کی زباں میں "ابتلا" لکھوں

تشکر کی زباں پہ حرفِ صادق آیا جاتا ہے
بحکمِ حضرتِ احسانؔ دانش اور کیا لکھوں

ادب کی مملکت میں اس صدی کا یہ مجدّد ہے
کھلے لفظوں میں لکھوں صاف لکھوں برملا لکھوں

اب اپنی نظم سے شورشؔ مجھے اندازہ ہوتا ہے
لکھوں تو اس طرح جذباتِ دل کی انتہا لکھوں

(چٹان، ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء)

دورِ کم آگہی

فضا ابن فیضی

یہ صید گاہِ فکر و نظر" مقتلِ سخن"
چبھتے ہوئے حواس میں ناقدریوں کے تیر
جذبوں کے رو سمیٹے ہوئے زندگی کے غم
تیرِ جنوں، خرد کی کماں پر چڑھا ہوا
کانٹوں میں قیدِ تازگیِ فکر کے گلاب
یہ بے چراغ علم و بصیرت کی انجمن
بجھتے ہوئے سے دیدہ وری کے یہ خط و خال
یہ سرنگوں لطافتِ وجدان کے صنم
غلطیدہ خاک میں نگہہ و فکر کا وقار
یہ رات کے گلے میں حسیں چاندنی کا ہار
یہ شہر شہر عام " زیاں کاریِ ادب"
رشتہ بہ پایہ فکر کی قدروں کا ارتقا
یہ آگہی کا قحط یا ذوقِ نظر کا کال
حالات ذہن و فکر کا رو کے ہوئے بہاؤ
یہ سر اُٹھا کے چلتے ہوئے جہل کے امام
نشے ہیں عیشِ کم نگہی کے سبو سبو
حسنِ صلاحیت پہ نہ خوبیِ ذات پر
رکھتے نہیں ہیں ظرف، حریفانِ انجمن
رگ رگ سے آج پھوٹ پڑی ہے لہو کی تو
فانوسِ گل، شعور کے آئینے پاش پاش
زخمی بصیرتیں یہ سسکتے ہوئے یقیں
پابندیاں ہیں سوچ پہ، پہرے شعور پر
پوچھو نہ ہم سے ہمنفسو! راہ و رسمِ شہر
فن کی ریاضتوں کا یہاں کچھ صلا نہیں
یہ راستوں کی دھوپ پہ جھلسے ہوئے قدم

زخموں سے چور چور ہے "پندارِ فکر و فن"
یہ چیختے ہوئے ادب و شعر کے ضمیر
اپنی ہی موجِ خوں میں یہ ڈوبے ہوئے قلم
احساس و آگہی کا گریباں پھٹا ہوا
ظلمت میں ڈوبتا ہوا ماتھے کا ماہتاب
یہ شب گزیدہ روشنیِ طبع کی کرن
تلتے ہوئے غبار میں شہ پارۂ خیال
ڈوبی ہوئی فغاں میں یہ محرابِ کیف و کم"
سائے میں شاخِ گل کے سلگتی ہوئی بہار
یہ پیتلوں کے دیس میں سونے کا بیوپار
بڑھتی ہوئی یہ "پستیٔ معیار" کی طلب
یہ طوق در گلو ادب و فن کے دیوتا
ملتا ہے وقت جہل کے رخسار پر گلال
ہیرے کی یہ دکان یہ کنکر کا مول بھاؤ
بکتی ہوئی متاعِ نظر کوڑیوں کے دام
سچائیاں ہیں خاک بسر، جھوٹ سرخرو
نظریں ہیں آدمی کے "طلائی صفات پر"
رہنے کہیں نہ جان یہ ماحول کی گھٹن
یہ کارگاہِ زیست ہے دانشوروں کی موت
آنکھوں سے جھانکتی ہوئی احساس کی خراش
ڈوبے ہوئے ہیں "خدایانِ انگبیں"
بیٹھی ہے گرد آئینۂ رنگ و نور پر
"تحسینِ ناشناس" کا پینا پڑا ہے زہر
"پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں"
اب سوچنا پڑا ہے یہ اے شوخیٔ قلم

عشوؤں میں آگہی کے گرفتار کیوں ہوئے
ہم لوگ ایسے دور میں فنکار کیوں ہوئے

بولتے زخم

ساقی جاوید ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

کون سمجھے کہ اسی دہر میں کتنے مہتاب
اپنی آغوش میں رکھتے ہیں لہو کے سیلاب

کتنے زم زم کے سبو زہر کے پیمانے ہیں
معبد و دیر عقائد کے "ممی خانے" ہیں

کتنے ہیروں سے ٹپکتا ہے ہلاہل اب تک
کتنے شعلے ہیں دل و جاں کے مقابل اب تک

کتنے پھولوں کی تباہی ہے نظر کے آگے
کتنی صبحوں کی سیاہی ہے نظر کے آگے

موسمِ گل کے ستم سہتی ہیں کلیاں کتنی
ڈوب جاتی ہیں اسی سوچ میں کلیاں کتنی

خون پانی سے بھی سستا ہے زمیں پر اب تک
آتشیں قہر برستا ہے زمیں پر اب تک

وقت کی زلف کو ہر گام پہ بل دیتے ہیں
لوگ ہر پھول کو چٹکی سے مسل دیتے ہیں

کتنے خورشید ہیں ظلمت کے لبادوں میں ابھی
پیچ ہی پیچ ہیں تہذیب کے جادوں میں ابھی

سیل در سیل بہاروں کا لہو بہتا ہے
نقش کیا جانئے نقاش سے کیا کہتا ہے

شمع جلتی ہے تو اشکوں کا صلہ پاتی ہے
زندگی دیکھئے کس طرح جلا پاتی ہے

کوئی سقراط جو اٹھتا ہے تو دنیا والے
سمِ قاتل کے لگا دیتے ہیں منہ سے پیالے

کوئی مریم جو مسیحا کو جنم دیتی ہے
شہر کی رسم اسے دیدۂ نم دیتی ہے

کوئی سرمد جو سوئے شہر نکل آتا ہے
اژدہا غارِ سیاست کا نگل جاتا ہے

دل کا خوں نوکِ قلم سے جو ٹپک جاتا ہے
وقت کی آنکھ میں کانٹا سا کھٹک جاتا ہی

اب تو کچھ تم ہی کہو، تم ہی بتاؤ ہم کو
لوگ کس طرح تبسم میں چھپائیں غم کو

فرعون، فرشتۂ غیبی اور ابلیس

طالب جے پوری

(دربار فرعون — ایک فرشتۂ غیبی نووارد کے بھیس میں داخل ہوتا ہے)

(آداب بجالا کر فرعون سے مخاطب ہوتا ہے)

نووارد:۔

اے جہاں کے حکمراں، اے ہم غریبوں کے خدا — سرنگوں ہیں اک اشارے پر ترے ارض و سما
ثبت ہے دُنیا کی ہر شے پر تری مہر جلال — کر نہیں سکتا ترے آگے کوئی چون و چرا
اک تذبذب سا ہے مجھ کو پھر بھی گستاخی معاف — چاہتا ہے راستہ دل کوئی اطمینان کا
ساتھ اپنے خوشۂ انگور اک لایا ہوں میں — اپنی قدرت سے اِسے سونے کا تو کر دے ذرا
تاکہ ہو تیری خدائی پر مجھے کامل یقیں — اور دل بھی ہو سکے میری زباں کا ہم نوا

فرعون:۔ (اپنے دل میں)

اہل دنیا گو سمجھتے ہیں مجھے ذی اختیار — کہتے ہیں اکسیر سے بڑھ کر ہے میری خاکِ پا
ہیں یقیناً مختلف چیزیں نباتات و جماد — خوشۂ انگور ہو سونے کا یہ ممکن ہے کیا
کس طرح سونے کا کردوں خوشۂ انگور کو — سخت ہے یہ امتحاں، دشوار ہے یہ مرحلا
کس بہانے سے اسے رخصت کروں حیراں ہوں — کس طرح ٹالوں میں اپنے سر سے آخر یہ بلا

(کچھ سوچ کر نووارد سے)

آج تو مصروف ہوں میں سلطنت کے کام میں — خوشۂ انگور کل سونے کا یہ ہو جائے گا

(نووارد جاتا ہے — ابلیس داخل ہو کر فرعون سے کہتا ہے)

ابلیس:- کیا اسی برتے پہ تھا تجھ کو خدائی کا غرور
تیرے دعووں کا بھرم اک آن ہی میں کھل گیا

بات کیا تھی جس نے تیرے کھو دیئے ہوش و حواس
کام لیتا عقل سے تو امر یہ مشکل نہ تھا

سرخرو ہوتا اگر تو یاد کر لیتا مجھے
اور رہ جاتا خدائی پر تری پردہ پڑا

بے خرد کیسی خدائی، بندگی ممکن نہیں
اتنی دعوے میں تعلّی، عقل ایسی نارسا

(پھر کچھ سوچ کر فرعون کو غور سے دیکھتے ہوئے)

ابلیس۔ تو نے اے فرعون! آخر یہ بھی سوچا ہے کبھی
تیرے ان دعووں کا ہوگا ایک دن انجام کیا

تجھ کو آیا ہے کبھی فرعونِ ثانی کا خیال
اور آیا تو دماغ و دل کا کیا عالم ہوا

جب ترا یہ حال ہے تو غیرتِ ربِّ جلیل
کیسے کرے گی گوارا تیرا جھوٹا اِدّعا

فرعون۔ (خفت سے سر جھکا لیتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر فاتحانہ انداز میں)

کیوں مجھے اب موردِ الزام ٹھہراتے ہیں آپ
آپ کی تعلیم کا فیضان تھا جو کچھ بھی تھا

میری اس تضحیک میں خود آپ کی توہین ہے
کیا نہیں کچھ واسطہ شاگرد سے استاد کا

کون دنیا پر کرے گا اب کسی پر اعتبار
آپ سا مشفق کرے جب طعن مجھ پر برملا

آپ کے آگے ہے کیا میری فراست کی بساط
آپ اتنا تو بتا دیجئے مگر مجھ کو ذرا

آپ تو عالم بھی تھے، دانا بھی تھے، عابد بھی تھے
آپ نے آدم کے آگے کیوں نہ پھر سجدہ کیا

ابلیس:- (حقارت سے مسکراتے ہوئے)

سن مرا انکارِ سجدہ اصل میں اک راز ہے
تو نے پوچھا ہے تو آخر رازِ دل کہنا پڑا

مجھ پہ ظاہر تھا شرف آدم کا۔ خالق نے جسے
علمِ اسما بخش کر منصبِ خلافت کا دیا

جراَتِ انکار کر سکتا تھا میری کیا مجال
میرا منشا حکمِ ربّانی سے سرتابی نہ تھا

اس لئے سر خم کیا میں نے نہ آدم کے حضور
جانتا تھا نسل میں اس کی ہے تجھ سا بے حیا

شارق ایم۔ اے

ہم رہروانِ شوق کو اس کی خبر کہاں　　ہوتی ہے اپنی شام کہاں اور سحر کہاں
اے دل تجھے سکون کی دولت نصیب ہو　　رہتا ہے بے قرار کوئی عمر بھر کہاں
آرائشِ جمال سے فرصت نہیں جنھیں　　ان کو ہمارے حال کی شارق خبر کہاں

آنکھوں آنکھوں میں دل کی کہہ جانا　　وہ مرا اشک لا کے رہ جانا

عاصم جے پوری

کیوں پریشاں ہوں غمِ ہستی کا قصہ چھیڑ کر　　کیوں نہ گیسوئے بُتِ طناز کی باتیں کریں
کیوں نمودِ خارِ غم ہو مانعِ سیرِ چمن　　کیوں نہ گلہائے بہارِ ناز کی باتیں کریں
طالعِ ناساز کو ہونا پڑے گا سازگار　　آئیے کچھ دیر سوز و ساز کی باتیں کریں

دوش نگارِ من زمن　شوخیِ چند وام کرد　　رفت و بردِ دلِ من چو من　یک دو قدم خرام کرد
نام مرا گرفت و گفت　عاصمِ خستہ تن منم　　شعر مرا سرود و ہم　ہمچو خودم کلام کرد
در دلِ بادہ کہن کیف　سر دِرِ نو نہاد　　نرگسِ غمزہ مست را　خوگرِ ابتسام کرد
جانم ازاں نظر کہ　بود حاصل سوز آرزو　　رنگ نشاط لبت　وہم ساز غم دوام کرد

منظر ایوبی

اُس طرف چوم چکے لوگ ستاروں کی جبیں　　ہم ادھر نغمہ گرِ گیسوئے جاناں ہی رہے
اور ہوں گے کہ جنھیں موسمِ گل راس آیا　　ہم تو اس زلف کی مانند پریشاں ہی رہے
ہم نے کھلنے نہ دیا تیری محبت کا بھرم　　دردِ غم سہتے رہے اور غزل خواں ہی رہے

سعادت نظیر

منزلِ شوق کی بڑھ نہ جائیں کہیں اور گھٹتی ہوئی دوریاں دوستو!　　رُک نہ جائیں قدم ورنہ ہو جائیں گے ہم غبارِ رہِ کارواں دوستو!
میں وہی طائرِ پر شکستہ ہوں، جو تھا کبھی ایک عرش آشیاں دوستو　　دیکھنا طے کروں گا کبھی ایک ہی جست میں عرصۂ دو جہاں، دوستو!
مثلِ شبنم بفیضِ نگاہِ کرم ہے کم و بیش ہر سمت میرا بھرم　　ہے نشیمن مرا غنچۂ گل کبھی اور مسکن کبھی آسماں دوستو!
دشتِ پُر خار سے کون آشفتہ سر آبلہ پا گیا ہے کہ یہ گل کھلے　　تا بہ حدِ نظر اب ہے پھولوں کا بن یا چمن در چمن گلستاں دوستو!
ہر تمنا سعادت کی جب لُٹ گئی، زندگی ایک احساسِ غم ہو گئی　　خوں نہ رونا پڑے تم کو سن کر کہیں اس کی حسرت بھری داستاں دوستو!

مطبوعات موصولہ

ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم

از۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
پبلشرز۔ ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی۔
قیمت:۔ ایک روپیہ پچیس پیسے۔

یہ کتاب برصغیر کے ممتاز تعلیمی مفکر ڈاکٹر ذاکر حسین کے ان تین لکچروں پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۹ء میں "پٹیل میموریل" کی سالانہ تقریب کے موقع پر انگریزی میں دیئے گئے تھے اور جنھیں بعد میں ڈاکٹر عابد حسین نے اردو میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین تہذیبی و تعلیمی مسائل کے حل میں غیر معمولی درک و انہماک رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے برصغیر کی شاید ہی کوئی ملی و سماجی تحریک ہو جو اُن کے خیالات و افکار سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ آزادی کے بعد قومی نظام تعلیم کو نئی شکل دینے اور اس میں ایک فعال روح دوڑاتے میں ان کے ان تعلیمی خطبات کو بڑا دخل ہے جو جامعہ تعلیم ملی کے ذریعے بہت پہلے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے خطبات میں تعلیم کے نظری مسائل پر ایسی فلسفیانہ بحث کہیں نہیں ملتی جس کا سرا ہمارے ہاتھ نہ آسکے۔ وہ ہمیشہ اس کے لائحۂ عمل اور حصولِ مقاصد کے ذرائع کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے ہیں وہ تعلیم کی اصل غایت، اشاعت اور مدارج پر حکیمانہ نظر ڈالتے ہیں لیکن اس کی عملی صورتوں کو کسی جگہ بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر خصوصاً "ہندوستان" کے تعلیمی ڈھانچے میں جتنا حصہ اُن کی تجویزوں اور تحریکوں کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔

آج جو لوگ قومی نظامِ تعلیم کی تشکیلِ نو کے نام سے محض تعلیمی اوقات و نصاب کی تبدیلی و ترمیم ہی پر سارا زور صرف کر رہے ہیں انھیں ذاکر حسین کا یہ قول نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ:۔

"تعلیم کی از سر نو تعمیر کا عظیم الشان مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ دفع الوقتی کے لئے جزوی انتظامات میں کچھ الٹ پھیر کر دی کسی منزل میں ایک سال بڑھا دیا کسی میں گھٹا دیا۔ کہیں ایک آدھ مضمون کا اضافہ کر دیا۔ بری درسی کتابوں کو نکال کر اگر مل سکیں تو ان سے بدتر نصاب میں رکھ دیں۔ اسکول وہی رہے نام بدل دیا۔ اور نہ وہ اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ تعلیم کے دائرے کو بڑھاتے چلے گئے۔ بغیر اس کے اغراض و مقاصد کو اچھی طرح سمجھے اور بغیر اس کا لحاظ رکھے کہ وسائل اور مقاصد میں پوری طرح مطابقت ہو۔"

غرض کہ ذاکر حسین کے تعلیمی خطبات برصغیر کی تعلیمی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور چونکہ ان کا انداز بیان مدلل ہونے کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی اور دلکشی کا بھی حامل ہے اس لئے ادبی حیثیت سے بھی انھیں امتیازی مقام حاصل ہو گیا ہے۔

برگِ نوخیز

عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ ہے۔ سانٹ فنی اور معنوی حیثیت سے مغرب کی ایسی صنفِ سخن ہے جو مصرعوں کی معین تعداد اور وزن و قافیہ کے مخصوص نظام کی بنا پر مشرقی مذاقِ سخن سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ سانٹ کا فنی نظام بڑی حد تک اردو فارسی رباعی سے مماثل ہے۔ رباعی کی طرح سانٹ کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں وزن قافیہ اور مصرعوں کی معین تعداد سے انحراف نہ کیا جائے۔ فرق یہ ہے کہ سانٹ میں چودہ مصرعوں کی قید ہے اور رباعی میں چار کی۔ ورنہ دونوں میں پوری بات ایک خاص اہتمام سے کہی جاتی ہے اسطرح کہ ابتدائی مصرعوں میں خیال کو روشناس کرایا جائے آگے چلکر موضوع کے خد و خال کچھ اور نمایاں کئے جائیں اور آخری مصرعوں میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت سے سامنے لایا جائے کہ سننے والا ایک خاص سرور و کیف کے ساتھ نفس مضمون کو ذہن میں محفوظ کر سکے۔ سانٹ کی یہ پابندیاں اسے خاصا مشکل بنا دیتی ہیں اور جب تک کوئی شاعر کسی وسیع خیال کو مجملاً بیان کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ سانٹ نگاری کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

ہر چند کہ اُردو سانٹ کی ابتدا کرنے والے احمد میاں اختر جونا گڈھی اور ن م راشد ہیں اور اس پر طبع آزمائی کرنے والوں میں اکثر نئے شعرا شامل ہیں لیکن اسے کامیابی اور خصوصیت سے برتنے والے چند ایک سے زیادہ نہیں ہیں، ان میں عزیز تمنائی اور عابد رضوی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ عابد رضوی کے سانٹ مختلف رسائل میں نظر آتے ہیں۔ اور عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ "برگ نوخیز" اردو سانٹ کے اولین مجموعہ کی حیثیت سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں ۱۰۹ سانٹ شامل ہیں اور چونکہ ان میں موضوع کی رنگارنگی کے ساتھ وہ محاسن بھی نظر آتے ہیں جو سانٹ کے انداز بیان اور فنی نظام کے لئے مخصوص ہیں اس لئے یقیناً یہ مجموعہ قبول عام حاصل کرے گا اور عزیز تمنائی کے نام کو اردو سانٹ نگاری کی تاریخ میں سرفہرست رکھے گا۔

کتاب سفید کاغذ پر ٹائپ میں خاص اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ سرورق خوبصورت ہے اور کتاب دو روپے پچاس پیسے میں دار التصنیف مدراس ۱۴ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

آفتابِ ہجویر

از پیام شاہجہان پوری
ناشر ملک سراج الدین اینڈ سنز۔ لاہور
قیمت دو روپیہ

"آفتاب ہجویر" برصغیر کے مشہور روحانی پیشوا سید ابو الحسن علی ہجویری کی سیرت و سوانح کا مرقع ہے۔ حضرت علی ہجویری عہد غزنوی کے ان باکمال صوفیا میں سے ہیں جن کا حلقۂ اثر پاک و ہند سے لیکر افغانستان و ایران تک پھیلا ہوا تھا۔ تصوف کی مشہور ترین کتاب "کشف المحجوب" جسے برصغیر کے نظام روحانی کے قیام و استحکام میں بڑا دخل ہے انھیں بزرگ کی تصنیف ہے۔ ان کے چیدہ چیدہ حالات تو اکثر جگہ مل جاتے ہیں لیکن پوری تصویر سامنے نہ

تھی ۔ پیام شاہجہاں پوری نے "آفتابِ ہجویر" کے ذریعہ اس کمی پورا کر دیا۔
اس کتاب میں مؤلف نے صرف حضرت علی ہجویری کے حالات و سوانح جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے افکار و نظریات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ ان کے اوصاف و کمالات، اذکار و اشغال اور تصانیف و پیغامات سب پر ایسی مشرح بحث کی گئی ہے کہ ایک طرف یہ کتاب حضرت ہجویری کی زندگی و شخصیت سے روشناس کراتی ہے تو دوسری طرف تصوف کے رموز و علائم کو علمی طور پر سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ نہ صرف حلقۂ صوفیا میں، علمی و ادبی حلقے ہیں کم اس کتاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

راز زاز یزدانی" جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے، رام پور کے علمی و ادبی حلقے کے ان بزرگوں میں تھے جو سخن گوئی کے ساتھ ادبی تحقیق و تنقید کا بھی خاصا درک رکھتے تھے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ اردو کے تقریباً سارے معتبر ناقدین سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت اردو ادب کے عام قارئین تک ابھی نہیں پہنچی۔ عابد رضا بیدارؔ صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ان کی وفات کے فوراً بعد ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب "راز" کے نام سے مرتب کر کے "نیا خواب رامپور" کے زیر اہتمام شائع کر دیا۔ یہ انتخاب رازؔ یزدانی کے نام کو حلقۂ خاص سے باہر دربار عام تک لے جائے گا۔ اور ان کے کلام کو قبولیت بخشے گا۔
یہ انتخاب ۵۰ پیسے میں نیا خواب رامپور سے مل سکتا ہے۔

انتظام کتب خانہ شیخ محبوب قریشی کی تالیف ہے ۔ اس میں مؤلف نے کتب خانے کی ترتیب و تنظیم اور کتابوں کی فنی تقسیم پر گفتگو کی ہے۔ انگریزی میں تو اس موضوع پر بے شمار کتابیں ہیں لیکن اردو میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اس کتابچہ سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ انگریزی سے ناواقفیت کی بنا پر ترتیب کتب خانہ کے جدید اصول سے آشنا نہیں ہو سکتے وہ اس کتاب کی مدد سے کتب خانوں کو ایک خاص قرینہ سے مرتب کر سکیں گے۔

کتاب محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدر آباد کالونی کراچی ۵ سے ایک روپیہ پچاس پیسے میں مل سکتی ہے۔

نادرات حضرت جگر کے شاگرد خاص جناب شبیر درانی کا مجموعۂ کلام ہے۔ آغاز کلام سے پہلے مولوی امیر الدین خاں رامپوری، رئیس امروہوی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی تقریظیں ہیں جن میں شبیر درانی کی شخصیت اور شاعری کا تعارف کرایا گیا ہے۔ شبیر درانی جیسا کہ اس مجموعہ کے سرورق پر درج ہے حضرت جگر کے جانشین ہیں۔ ان کا رنگ سخن بھی اُستاد کے رنگ سے بہت ملتا ہے۔ اس لئے اس کا عام و خاص دونوں میں پسند کیا جانا لازمی ہے۔
یہ مجموعۂ کلام جو ایک کتابچہ کی صورت میں ہے دو روپیہ میں مغربی پاکستان کے ہر شہر سے مل سکتا ہے۔

محبت شبیر الحسن ایم۔ اے (علیگ) کی تالیف ہے جس میں انھوں نے "محبت کیا ہے؟" کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوشش حکیمانہ نہیں شاعرانہ ہے۔ انھوں نے منطقی موشگافیوں کے ساتھ اس بحث کو نہیں چھیڑا بلکہ صرف شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس کے پہلوؤں اور کیفیتوں کی ترجمانی کی ہے۔ خصوصاً اردو فارسی کے شعراء نے محبت کے باب میں جو کچھ کہا ہے اسے نہ صرف یہ کہ یکجا کر دیا گیا ہے بلکہ حسب مقدور اس کی توضیح و تشریح بھی کی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب محبت سے متعلق اشعار کی شرح یا "لغاتِ محبت" کی دلآویز فرہنگ ہے جسے مؤلف نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ کتاب کا موضوع چونکہ عام و خاص دونوں کی

دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اس لئے ضرور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

کتاب دو روپیہ میں مقبول پبلشنگ ہاؤس نورانی مارکیٹ بی ایریا لیاقت آباد کراچی سے مل سکتی ہے۔

حیات امام ابن القیم

مصنف عبدالعزیز شریف الدین۔
مترجمہ سید رشید احمد ارشد استاد شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی

مصنف نے اصل کتاب میں آٹھویں صدی ہجری کے روشن خیال اسلامی مفکر امام ابن قیم کی نجی زندگی۔ تعلیم و تربیت افکار و خیالات، معقولات و تجددات اور تالیفات و تصنیفات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس طور پر کہ امام ابن القیم کی زندگی و فکر کا کوئی پہلو تشنۂ تحقیق نہیں رہا۔ رشید احمد ارشد نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

ترجمہ کا کام بظاہر جتنا آسان نظر آتا ہے اُتنا آسان نہیں ہوتا۔ کسی مصنف کے افکار و خیالات کو جبکہ ان کا تعلق علم و فن کی فلسفیانہ موشگافی اور باریک بینی سے ہو۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اور پوری معنویت و تاثیر کے ساتھ منتقل کرنا آسان ہو کر بھی غالب کے اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی کہ دشوار بھی نہیں

اگر افکار و خیالات کو کسی طور پر منتقل بھی کر لیا جائے تو اصل زبان اور مصنف کا وہ لب و لہجہ اور اسلوب جو اصل کتاب کے حسن و اثر کا ضامن ہے۔ ترجمہ کی گرفت میں نہیں آتا۔ اور جب تک اصل کتاب کا یہ داخلی پہلو ترجمہ میں حتی الوسع نمایاں نہ ہو ترجمہ بے معنی رہتا ہے۔ اس میں کامیابی کے لئے مترجم کو بڑے غور و فکر اور محنت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ایک لفظ کی تلاش اور جملوں کی ساخت کے لئے وہ گھنٹوں سر کھپاتا ہے۔ محاورات و استعارات کے بامعنی اور شگفتہ ترجموں کے لئے کئی کئی دن جستجو کرتا رہتا ہے۔ جب کہیں کوئی ترجمہ اصل کو منہ دکھانے کے لائق ہوتا ہے۔ رشید احمد ارشد کے ترجمے سے ان کی تلاش اور محنت دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ پانچسو سے زاید صفحات پر مشتمل عربی کتاب کو انھوں نے نہایت آسان، بامحاورہ اور موثر انداز میں اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ساتھ ہی اپنے مقدمہ میں مصنف اور کتاب کے موضوع دونوں کا تعارف کرایا ہے۔ یہ تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔

کتاب مجلد ہے اور بارہ روپیہ میں نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱ سے مل سکتی ہے۔

جامعہ دہلی

(جائزہ نمبر)

اُردو کے ماہناموں میں "جائزہ دہلی" جسے ان دنوں عبداللطیف اعظمی مرتب کرتے ہیں۔ علم و ادب کی گراں قدر روایت کا حامل ہے اور زیر نظر شمارہ اسی روایت کا ایک نشان ہے جس میں ۱۹۶۲ء کی اردو مطبوعات، ادارات رجحانات اور علمی و ادبی کام کی رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے اس میں سب سے اہم اور طویل مقالہ جو تقریباً نصف شمارہ پر مشتمل ہے انیس خورشید صدر شعبۂ لائبریری سائنس کراچی یونیورسٹی کا ہے جس میں پاکستان میں شائع ہونے والی تین سو کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ میں ظاہر ہے تفصیل کی گنجائش نہ تھی پھر بھی ہر کتاب کی نوعیت و خصوصیت پر اجمالاً جو کچھ لکھا گیا ہے صرف یہی نہیں کہ اس سے صاحب مضمون کی وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، محنت اور تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ کتابوں کی اشاعتی رفتار اور ان کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ رسالہ کے باقی نصف میں زیادہ تحریریں عبداللطیف اعظمی کی ہیں۔ اعظمی صاحب نے "تحقیقی ادب" ہندوستان کے تصنیفی ادارے اور ۱۹۶۲ء کی مطبوعات پر سرسری نظر کے

عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ حد درجہ افادی ہے " دنیات " کے عنوان سے ۱۹۶۲ء میں وفات پانے والے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کر کے انھوں نے اس پرچے کو اور بھی تاریخی بنا دیا ہے ۔ چند صفحوں میں دو تین مختصر مضامین اور بھی ہیں لیکن وہ چنداں اہم نہیں ہیں ۔

رسالہ ایک روپیہ میں جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

گنجینۂ گوہر

شاہد احمد دہلوی کے ادبی خاکوں کا مجموعہ ہے ۔ اردو میں خاکہ نگاری کا فن بہت پرانا نہیں ہے ۔ اس کی قدامت کو زیادہ سے زیادہ حالی اور شبلی کے آخری دور تک لے جاسکتے ہیں اس کی صنفی صورت کا احساس ہمیں دراصل مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے بعد ہوا ہے ۔ خاکہ نگاری کو بعض شعری اصناف کی طرح کسی منضبط اصول یا ہیئت کے گھیرے میں لا کر دیکھنا دکھانا تو سردست بہت مشکل ہے ۔ پھر بھی بعض اچھے خاکوں کی مدد سے کہہ سکتے ہیں کہ موضوع سے گہری اور ذاتی واقفیت ، زندگی کے جزئیاتی مشاہدہ ، تیز حافظہ ، حقیقی سوانحی مواد اور بے تکلف انداز بیان کے بغیر خاکہ وجود میں نہیں آتا ۔ ان رنگوں میں سوانحی صداقت اور دلکش اسلوب کو خاکہ پر ہر جگہ حاوی رہنا ضروری ہے ورنہ خاکہ بھی عموماً سوانح یا تاریخ نگاری کا خشک مضمون بن کر رہ جاتا ہے شاہد احمد دہلوی چونکہ فنِ خاکہ نگاری کی نزاکتوں کے احساس کے ساتھ سادہ و پرکار نثر نگار بھی ہیں اس لئے ان کے اکثر خاکے کامیاب اور جاندار ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب میں ڈپٹی نذیر احمد اور میر ناصر علی سے لیکر استاد بندو خاں اور شاہد احمد دہلی تک کوئی اٹھارہ خاکے ہیں .... جو سوانح ، تاریخ اور ادب تینوں کے مطالعہ کا لطف دیتے ہیں ۔

قیمت :- چھ روپے ۔ ملنے کا پتہ :- مشتاق بکڈپو ۔ شکاگن روڈ کراچی ۱

بنگلہ اردو ٹیچر معہ گرامر

از مولانا قاضی شہاب الدین ۔

ناشر باب الاشاعت رابسن روڈ ، کراچی ۔ قیمت دو روپیہ پچاس پیسہ

اردو اور بنگلہ دونوں پاکستان کی قومی زبانیں ہیں اور ان دونوں سے واقفیت کے بغیر پاکستانی شہریوں ہم خیالی اور فکری یگانگت پیدا نہیں ہوسکتی جو پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لئے ضروری ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک کوئی ایسا عملی قدم کسی طرف سے نہیں اٹھایا گیا جس سے مشرقی پاکستان میں اردو اور مغربی پاکستان میں بنگلہ کو رواج دیا جاسکے نتیجۃً ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں سے دور اور یکجہتی سے محروم ہوتے جارہے ہیں ۔ حکومت اور عوام دونوں کو اسطرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ حکومت کی سطح پر نہ سہی ، نجی طور پر تو ہم اردو اور بنگلہ سے بہر طور واقف ہوسکتے ہیں لیکن اس کے لئے بنگلہ اور اردو کی ایسی چھوٹی چھوٹی کتابیں درکار ہیں جو دونوں زبانوں کے مماثل و مشابہ پہلوؤں اور تدریس زبان کے نئے اصولوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہوں ۔ قاضی شہاب الدین کی کتاب اسی نوع کی ہے ۔ انھوں نے اردو خواں طبقہ کے لئے بنگلہ تک رسائی کی راہ دکھا دی ہے اور یہ راہ کچھ ایسی آسان ، سیدھی اور دلچسپ ہے کہ جو اس پر چلے گا منزل تک بہرصورت پہنچے گا ۔

اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ نے اس سلسلے کے زیر عنوان اردو کے ممتاز و مشہور شعرا کا انتخاب شایع کرنا شروع کیا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر تین انتخابات ہیں۔

۱۔ اصغر گونڈوی

۲۔ الم مظفر نگری

۳۔ کیفی چریا کوٹی

ہر انتخاب ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور کتابچہ کی صورت میں سفید کاغذ پر عمدہ کتابت کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ امید کہ یہ انتخاب شعرا کو عام و خاص سے متعارف کرانے اور اردو کو مقبول عام بنانے میں مدد دے گا۔ ہر انتخاب کی قیمت ۷۵ پیسے ہے۔

بچوں کے ادب کی خصوصیات

از مشیر فاطمہ

ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ۔ قیمت ایک روپیہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ۸۰ صفحات کی یہ کتاب بچوں کے ادب کی نوعیت اور اس کی کیفیت و کمیت سے بحث کرتی ہے۔ ادیب یا شاعر یقیناً قدرت کی طرف سے جوہر خاص لے کر آتا ہے لیکن اس جوہر کو بروئے کار لانے کے لئے اکتساب، رہنمائی اور تربیت کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ آج جبکہ مادی زندگی سے ہم زیادہ سے زیادہ قریب اور جمالیاتی یا ادبی قدروں سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادبی ذہن و ذوق کی تہذیب و تربیت پر سائنٹفک طور پر غور کیا جائے۔ مشیر فاطمہ نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کے تعلیمی و تدریسی مسائل کو ذہن میں رکھ کر بتایا ہے کہ بچوں کے نصاب میں ادب کے معیار و مقدار کا تعین کس طرح کرنا چاہئے۔

میٹھی اور کھاری جھیل

سانبھر جھیل (جے پور) ۸۰ مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے جو سال کے آٹھ مہینوں میں (اکتوبر تا مئی) اس درجہ کھاری رہتی ہے کہ اس سے دو لاکھ ٹن نمک تیار کیا جا سکتا ہے لیکن برسات شروع ہوتے ہی اس کا کھاری پن غائب ہو جاتا ہے اور وہ یکسر شیریں ہو جاتی ہے۔

اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی کہ اس کا پانی کھاری سے شیریں کیسے ہو جاتا ہے۔

لیکٹوجن کی بدولت...

تندرست بچے
مطمئن مائیں

لیکٹوجن دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ پوری بالائی والے دودھ سے بنائی ہوئی بچوں کی غذا ہے۔
جس میں فولاد اور کئی ضروری وٹامن شامل کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیکٹوجن کے استعمال
سے ننھے ننھے بچے ہنسی خوشی پروان چڑھتے ہیں اور مائیں مطمئن رہتی ہیں۔
ماں کا دودھ چھوٹ جانے پر لیکٹوجن ہی دیجئے۔ یہ بچے کی تندرستی کی ضمانت ہے۔

(وٹامن اے، بی، بی۲، پی پی، بی، کیلشیم پنٹو تھینیٹ، بی۱۲، سی، ڈی اور فولاد)

جب ماں کا دودھ کارگر نہ ہو تو لیکٹوجن پر بھروسہ کیجئے

'The Lactogen Mother Book' ۸۰ صفحات کی یہ باتصویر
کتاب مفت حاصل کرنے کے لئے اس کوپن کو پُر کیجئے اور ڈاک خرچ
کے لئے پچیس پیسے کے ٹکٹوں کے ہمراہ اس پتہ پر روانہ کیجئے۔

نام ....

پتہ ....

....

نیسلز پروڈکٹس پوسٹ بکس ۴۹۶۴، ۱۵۔ ویسٹ وہارف روڈ۔ کراچی

LAC.1 63

آسٹر مِلک کا زمانہ

مسرّتوں سے بھرپور ہوتا ہے!

وہ زمانہ جب بچّے کی پرورش آسٹر مِلک پر ہوتی ہے، ماں اور بچّے دونوں کے لئے مسرّتوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ آسٹر مِلک بچّے کو تندرست و مطمئن رکھتا ہے جس کی بدولت اسے چین و آرام نصیب ہوتا ہے۔ دوسری طرف ماں کی مسرّتوں کی بھی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ وہ اپنی اولاد کو ہر طرح خوش و خرّم دیکھتی ہے۔

جی ہاں! آسٹر مِلک بچّے کی صحت اور مناسب نشوونما کے لئے مضبوط بنیادیں قائم کر دیتا ہے۔

آسٹر مِلک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچّوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے، اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسی لئے، اپنا دودھ چھٹ جانے پر یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے دانشمند مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچّوں کو آسٹر مِلک دیتی ہیں۔

آسٹر مِلک

ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل

بچّوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب

آسٹر مِلک کی کتاب اب اردو میں دستیاب ہو سکتی ہے۔ نیچے دیئے ہوئے پتہ پر ۵۰ پیسوں کے ٹکٹ بھیجئے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔

پی۔ او بکس نمبر ۴۶۷۴۔ کراچی ۲

OM-11-193-UD

نیلو ایک نئے روپ میں

فلمساز اقبال شہزاد

ہدایت کار:- رضا میر

موسیقی:- دیبو بھٹا چارجی

منظر نامہ:- رضیہ سرحدی

بیٹی

مؤثر کہانی
دلکش نغمات
لاجواب عکاسی
جذبات سے پُر اداکاری

سال رواں کی انتہائی دلکش اور بہترین تصویر

ستارے:- نیلو - اعجاز - ناصرہ - رضیہ
ساقی - حمید وغیرہ

بہت جلد نمائش کیلئے پیش کی جارہی ہے

تقسیم کار برائے
کراچی ○ سندھ ○ بلوچستان

امپیریل فلمس پیلس سینما بلڈنگ سول لائن کراچی

شاہی

صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے، صحت کا قائم رکھنا اہم ہے

شاہی تندرستی قائم رکھتے ہوئے قوتِ مدافعت کو بڑھاتی ہوا اور

امراض سے محفوظ رکھتے ہوئے حوصلہ و اُمنگ اور تر و تازگی بخشتی ہے۔

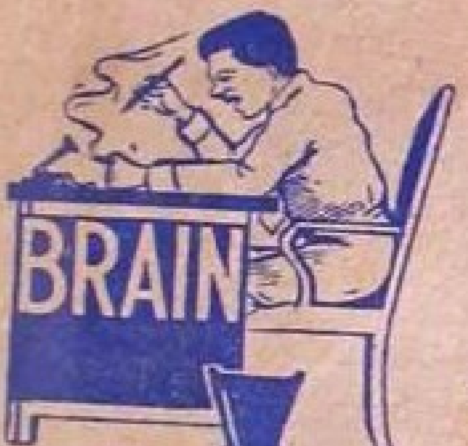

شاہی

دماغ

ضُعفِ دماغ کے مریض عموماً نسیان میں مُبتلا ہوتے ہیں

شاہی بہترین مقوّی دماغ ہے۔ دماغ کا بوجھ، خیالات کی پراگندگی،

چڑچڑاپن، کام کی طرف عدم رغبت وغیرہ کیفیات کو دفع کرتی ہے

شاہی

اعصاب

ضُعفِ اعصاب کے مریض عجیب کیفیات کے شکار ہوتے ہیں

شاہی ضُعفِ اعصاب کیلئے بہترین ٹانک ہے، اعصابی کمزوری، فاسد اور

حوصلہ شکن خیالات، اپنے پر عدم اعتماد، کسل و ماندگی کی دافع ہے۔

شاہی

طیبی دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد

حیاتین (ویٹامنس) اور کیلشیم سے بھرپور

افزائش خون کے لئے بہترین، عمدہ مقوّی دل و دماغ، معدہ و جگر

کی مقوی اور ہاضم طعام ہے

تیار کردہ

طیبی دواخانہ یونانی

نیپئر روڈ، کراچی

شاہی ہر بڑے اسٹور کو دستیاب ہوسکتی ہے

فون نمبر ۳۱۹۲۱

فہرست دواخانہ مُفت طلب فرمائیں

رجسٹرڈ نمبر ۲۲۷۲

نگارِ پاکستان کا خاص شمارہ

مصحفی نمبر

جس میں اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، انکی ابتدائی تعلیم و تربیت، انکی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقا انکی تالیف و تصانیف، انکی غزل گوئی و مثنوی نگاری۔ ان کے معاصر شعراء و ادباء اور انکے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اسمیں مولانا نیاز فتحپوری کے متعدد مقالوں کے علاوہ دوسرے معروف نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔ غرض مصحفی کی تذکرہ نگاری شخصیت اور شاعری کے متعلق سارے مباحث اس خاص نمبر میں اس قدر حسن و ترتیب و مورخانہ کاوش و استدلال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ مصحفی کو سمجھنے کیلئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قیمت: تین روپے 3/-

ادارۂ ادب عالیہ۔ کراچی۔ ۱۸

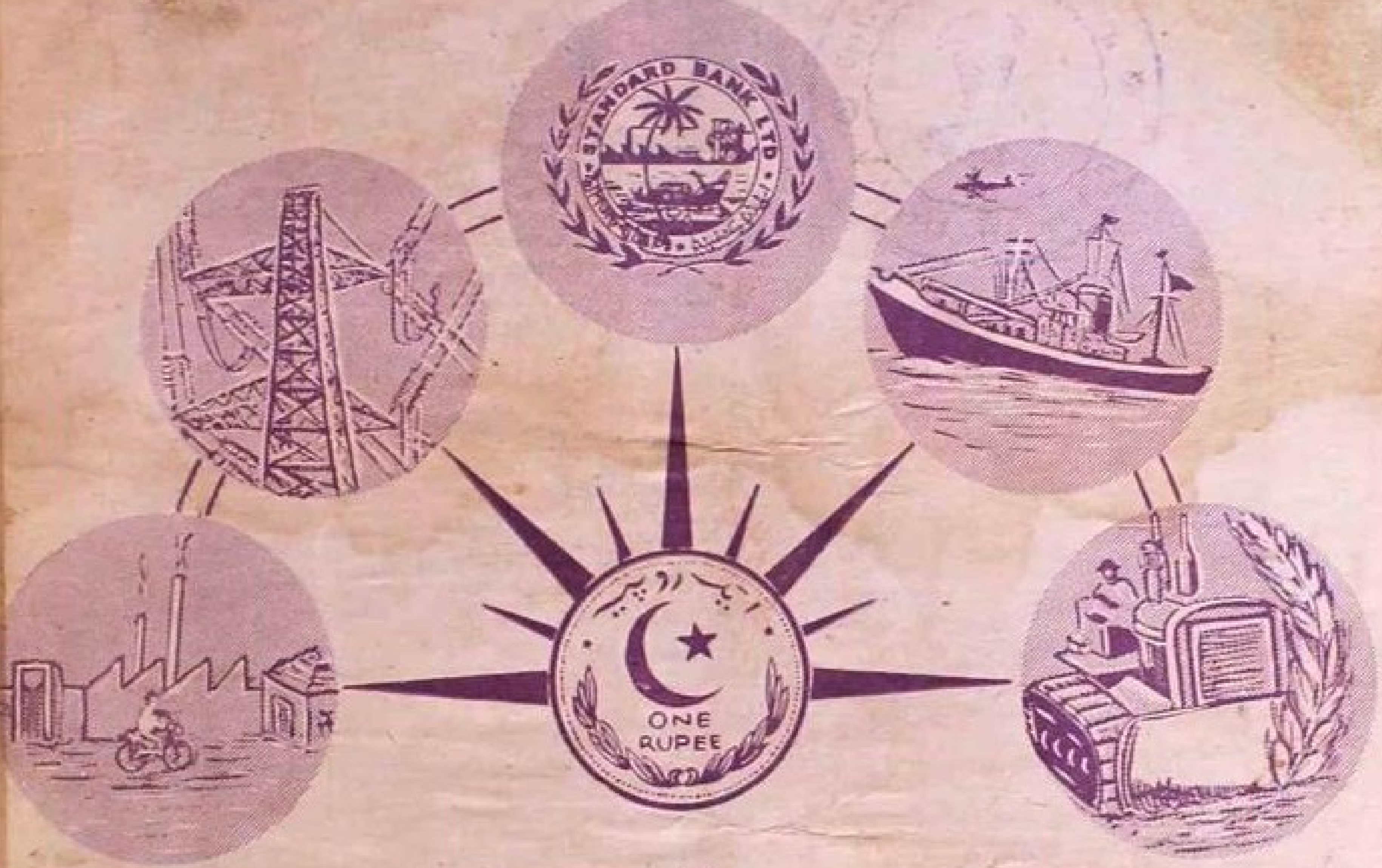

ساری اقتصادی ترقی

دولت ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے

پاکستان اقتصادی ترقی کی دوڑ میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اس رفتارِ ترقی میں اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ بحمداللہ اعانت اور خدمت کا نہایت ہی اہم فریضہ انجام دے رہا ہے۔

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ کی ملک کے دونوں بازوؤں میں پھیلی ہوئی

۲۷ شاخیں

ہیں جہاں بینکنگ سے متعلق ہر قسم کے کاروبار بشمول زرمبادلہ بہ احسن انجام دیئے جاتے ہیں۔

پانچ مزید شاخیں انشاءاللہ عنقریب ہی مغربی پاکستان میں منٹگمری اور جہلم اور مشرقی پاکستان میں نرائن گنج، کھلنا اور موتی جھیل ڈھاکہ میں کھل رہی ہیں۔

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: ۱۴۰ بیت الحمد۔ بندر روڈ۔ کراچی

MAKFA SBL. 63/14

خدا نمبر

قارئین کے اصرار پر

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں

شائع کیا جا رہا ہے

خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے اہم سوالات ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر باشعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن افسوس کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے۔ نگار کا ’’خدا نمبر‘‘ اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے۔

★

قیمت: تین روپے

کشتی حیات کا اگر محافظ ہے تو اسٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ
بینکنگ سے متعلق تمام کاروبار میں آپ کے مفادات کا نگراں اور ضامن رہے
یہ آپ کا اپنا بینک ہے اسکی مندرجہ ذیل

۲۴ شاخوں میں

بینکنگ سے متعلق تمام کاروبار بشمول زرمبادلہ احسن طریقے پر انجام دیے جاتے ہیں

کراچی
میکلوڈ روڈ۔ محمدی ہاؤس
بندر روڈ
۱۰۰۔ اے، انکل پوری مارکیٹ
صدر، وکٹوریہ اسٹریٹ
جوڑیا بازار، نزد بھی قبر
لارنس روڈ
منوڑا
حیدرآباد
شاہی بازار
پرنس علی روڈ

کوئٹہ
جناح روڈ
لاہور
شاہ عالم مارکیٹ
صدر بازار چھاؤنی
راولپنڈی کینٹ
ایڈورڈ روڈ
راولپنڈی سٹی
راجہ بازار
سرگودھا
ولایت بلڈنگ امباڑوالی روڈ

مردان:۔ بنک روڈ
پشاور کینٹ:۔ ۱۵۔بی صدر روڈ
لائلپور:۔ ریل بازار
ملتان:۔ چوک بازار
سیالکوٹ:۔ الائنس ایجنسی
کھاریاں کینٹ:۔ گرشین بیر
گوجرانوالہ:۔ پرانا ہسپتال روڈ
چاٹگام:۔ ایم۔اے۔جناح روڈ
لیہ:۔ چھاؤنہ روڈ
ڈھاکہ
۹۰۔ متی جھیل

اسٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ

ہیڈ آفس:۔ ۱۳۰۔ بیت المحمد، بندر روڈ کراچی